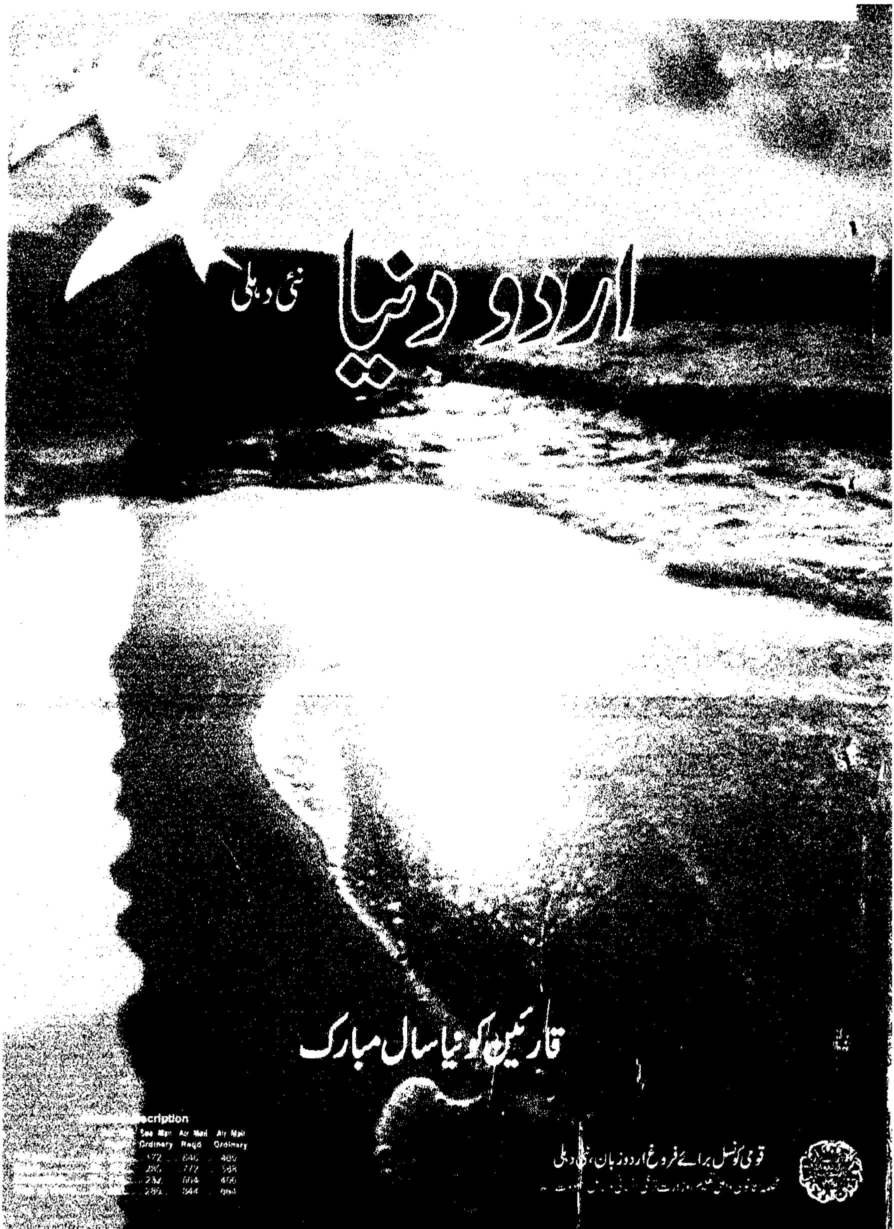
اردو دنیا
نئی دہلی
قارئین کو نیا سال مبارک
cription
Sea Mail Air Mail Air Mail
Ordinary Regd Ordinary
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

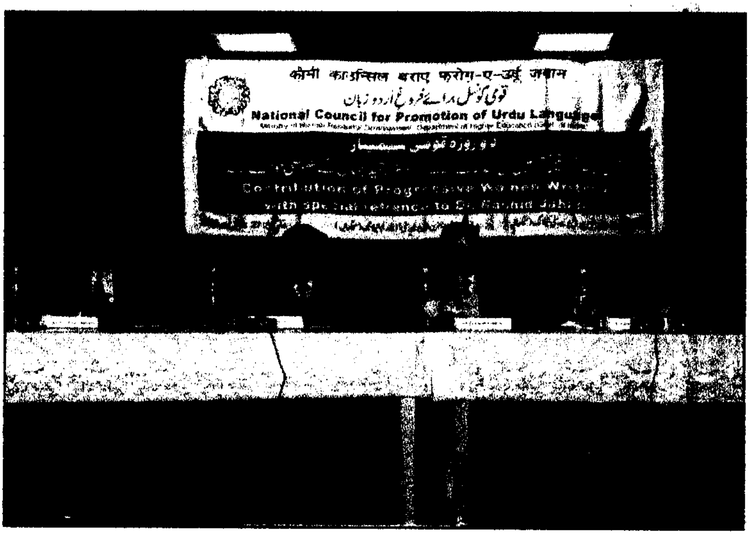

قومی اردو کونسل نے نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی، شیلانگ (میگھالیہ) کے اشتراک سے 27 تا 28 نومبر 2006 دوروزہ کانفرنس بعنوان ''ترقی پسند خواتین مصنفین کی خدمات — ڈاکٹر رشید جہاں کے خصوصی حوالے سے'' نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی آڈیٹوریم میں منعقد کی۔ اس کی افتتاحی تقریب کے موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) محترمہ رشمی چودھری (ڈائرکٹر انچارج قومی اردو کونسل)، پروفیسر پرمود ٹنڈن (وائس چانسلر، نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی)، پروفیسر قمر رئیس (وائس چیئرمین، دہلی اردو اکادمی)، پروفیسر فضیل احمد قادری (شعبۂ تاریخ نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی)۔

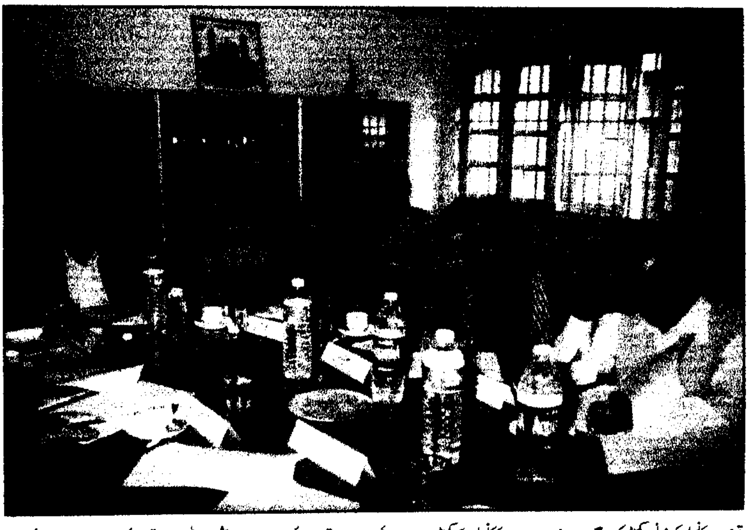

قومی اردو کونسل کی فنانس کمیٹی کی میٹنگ 23 نومبر 2006 کو کونسل کے کمیٹی روم میں ہوئی۔ اس موقعے پر (بائیں سے) جناب شمس الرحمن فاروقی (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل)، محترمہ رشمی چودھری (ڈائرکٹر انچارج قومی اردو کونسل)

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔1 جنوری 2007

مدیر: رشمی چودھری

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات ..... اداریہ 6

روبرو

● مرزا حامد بیگ سے گفتگو ..... فیروز عالم 7

زبان اور تعلیم

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف ..... شمس الرحمن فاروقی 13

● رومن اردو کیوں؟ ..... رؤف پاریکھ 16

● سنیما، ادب اور نصاب ..... راہی معصوم رضا 20

● ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات ..... ابوالکلام 25

● دانش گاہوں میں تحقیق: سمت و رفتار ..... ابن کنول 31

صحافت

● عالمی خبرنویسی کا ایک طرز خاص ..... شمس بدایونی 36

سائنس

● سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس ..... اقبال محی الدین 41

ادب

● یادوں کے نگارخانے سے ..... سید امتیاز الدین 45

ہماری مطبوعات سے

● ڈرپوک (''کلیات سعادت حسن منٹو'' سے ماخوذ) ..... سعادت حسن منٹو 48

● اشوک اور سلطنت مگدھ کی معراج (''قدیم ہندوستان کی ثقافت...'' سے اقتباس) ..... ڈی. ڈی. کوسمبی 52

اردو خبرنامہ ..... ادارہ 58

تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 71

بچوں کا گوشہ

● منے میاں کی بکری ..... نور الرحمن فاروقی 76

● نیتا جی سبھاش چندر بوس ..... افتخار الزماں 79

National Council for Promotion of Urdu Language * New Delhi *
ACC No. 5182
15/1/07
2010

آپ کی بات

■ مظہر امام، 176بی، پاکٹ-1، میور وہار، فیز-1، دہلی-110091

نومبر 2006 کے ''اردو دنیا'' میں جناب وہاب قیصر کا ایک مضمون مولانا آزاد اور ان کے رسالے ''لسان الصدق'' کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے علی محمود (بانکی پور، پٹنہ) کے ایک مضمون ''زبان کا قانون'' کا ذکر کیا ہے جو ''لسان الصدق'' کے اگست اور ستمبر 1904 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک طویل نوٹ لکھا تھا۔ اسی سے اس مضمون کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ علی محمود کون تھے؟ ان کے بارے میں تھوڑی سی معلومات اردو ادب کے عام قاری کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ علی محمود مشہور افسانہ نگار اور ادیب اختر اورینوی کے حقیقی ماموں تھے۔ ماہر قانون تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ عرصے تک سر علی امام کے پرسنل اسسٹنٹ رہے۔ لیکن ان کی زیادہ اہم جہت یہ ہے کہ وہ اردو مختصر افسانے کے اولین بنیاد گزاروں میں تھے۔ میں نے اپنے مضمون ''اردو ادب میں اولیت کے سہرے'' میں اردو کے ابتدائی افسانوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اردو کے اولین افسانہ نگاروں کی تثلیث سجاد حیدر یلدرم، علی محمود اور پریم چند سے بنتی ہے۔'' پروفیسر عتیق احمد (کراچی)، مرتب ''مضامین پریم چند'' نے اپنے مضمون ''اردو کا پہلا افسانہ نگار کون؟'' (ماہ نامہ ''صریر'' کراچی، اپریل 1991) میں علی محمود کے افسانوں ''چھاؤں'' اور ''ایک پرانی دیوار'' کا پورا متن شائع کرتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

مشہور افسانہ نگار مرزا حامد بیگ اردو افسانے کی تاریخ کے سلسلے میں استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تاریخی اعتبار سے اردو کے چودہ اولین طبع زاد افسانوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے'' (''آئندہ'' کراچی، نومبر، دسمبر 1997)۔ اردو میں سب سے پہلے شائع ہونے والے چار افسانوں کی فہرست اس طرح ہے۔

1. راشد الخیری: ''نصیر اور خدیجہ'': ''مخزن'' لاہور، دسمبر 1903۔
2. علی محمود: ''چھاؤں'': ''مخزن'' لاہور، جنوری 1904۔
3. علی محمود: ''ایک پرانی دیوار'': ''مخزن'' لاہور، اپریل 1904۔
4. وزارت حسین اورینی: ''افسانۂ حرماں یعنی مرگ محبوب'': ''اردوئے معلی'' علی گڑھ، جون 1905۔

سجاد حیدر یلدرم کا نام چھٹے اور ساتویں نمبر پر ہے اور پریم چند کا گیارھویں اور چودھویں نمبر پر، بر سبیل تذکرہ وزارت حسین اورینی، اختر اورینوی کے والد تھے۔

■ جی. ڈی. چندن، 46 جنگ پورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی۔

مولوی محمد باقر پر میرا مضمون آپ نے دسمبر 2006 کے شمارے میں ''قومی صحافت کا معمار اول'' کے عنوان کے تحت شائع کیا ہے جس کے لیے میں از حد ممنون ہوں۔ یہ مضمون فاضل مدیر کی خواہش اور تجویز پر لکھا گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ 1857 کی جنگِ آزادی کو جس کی 150ویں سالگرہ ہم ابھی منا رہے ہیں 'جانچنے والا اور قدرے مفصل ہو چنانچہ میں نے اس کے لیے نئی ریسرچ کی اور کئی نئے نکات دریافت کیے جو اس مضمون میں شامل کیے گئے۔ مضمون ملنے کے بعد آپ نے غالباً محسوس کیا کہ یہ آپ کی توقع سے زیادہ طویل ہے۔ لہٰذا آپ نے اسے مختصر کر کے شائع کیا۔

میں مدیر کے اختصار کے حق کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں لیکن بدقسمتی سے اس عمل میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا ہے۔ بعض حقائق رخصت ہو گئے ہیں۔ میں ان کی فہرست سازی نہیں کرنا چاہتا لیکن قارئین کے استفادے اور ریکارڈ کی صحت کے لیے مختصراً یہ گذارشات پیش کر رہا ہوں۔

مصحفی کا نہایت موزوں اور وقیع شعر مطبوعہ مضمون میں شامل ہے لیکن اپنے پس منظر سے محروم ہو جانے کے بعد یہ یتیم ہوگیا ہے حالانکہ اپنے پس منظر کے ساتھ یہ بھی رخصت ہوسکتا تھا۔

اپنے زعم میں تاجر سے حاکم بن جانے والی ایسٹ انڈیا کمپنی کی دراز دستیوں کے تین ٹھوس محرکات دیے گئے تھے جو یکسر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

قدیم مدرسے (غازی الدین) کی ہستی اور حیثیت ختم کر کے اسے دلی کالج بنانے والی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی لیکن یہ امر چھوڑ دیا گیا ہے۔

مولوی محمد باقر نے اپنے دینی عقائد کے لیے ''مظہر الحق'' کے نام کا اخبار اپنے ''دہلی اردو اخبار'' کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ''بعد میں'' جاری کیا تھا۔ یہ نکتہ بھی اختصار کی نظر ہو گیا ہے۔

دلی کالج کے ماسٹر رام چندر اور صحافی پربھو دیال کے اخبارات مولوی محمد باقر کے مطبع میں ہمیشہ نہیں چھپے۔ صرف ابتدائی مدت میں ایسا ہوا۔

قلمی وقائع نگاروں کے اخباروں کے اثر و رسوخ پر کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کی رپورٹ (1836) کا حوالہ یکسر حذف ہو گیا ہے۔

بغاوت کے فروغ میں نوجوان مولوی محمد حسین آزاد کی گہری دلچسپی سے ان کے والد مولوی محمد باقر کی زندگی ہی میں دوسری نسل کی فرنگی راج سے بیزاری کا نکتہ بھی چھوٹ گیا ہے۔

میری حقیر رائے میں ایک مضمون اپنے قاری کا علمی سفر ہوتا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنی ذہنی منزل تلاش کرتا ہے۔ یوں ایک مضمون اپنے قاری کی امانت ہو جاتا ہے۔ یہ عریضہ فدوی کے اسی مقصد کی جانب ہے۔

بہر حال انحصار کے باوجود مطبوعہ مضمون کی افادیت برقرار ہے۔ 1857 کی عظیم بغاوت کے موضوع پر یہ بدستور کچھ نئے نکات پیش کر رہا ہے۔ حال ہی میں مشہور غیر ملکی ادیب اور مورخ مسٹر ولیم ڈلرمپل (William Dalrymple) نے جو اپنی نئی تحقیقی کتاب The Last Mogul: کی پبلیسٹی کے لیے یہاں آئے تھے، کہا تھا کہ ہندوستانی مورخ معلومات کی وسعت کاری نہیں کرتے۔ بس اسے آپس میں بانٹتے رہتے ہیں۔ (انڈین ایکسپریس، نئی دہلی 30.10.06) مزید کہا تھا کہ 1857 پر بیشتر معلومات فارسی اور اردو ہی میں دستیاب ہیں (ہندو، نئی دہلی 29.10.06) اگر ان کا ذوق تلاش اب بھی موجود ہے تو انھیں کم از کم یہ مختصر مضمون ضرور دیکھ لینا چاہیے۔

■ **سوہن لال کھلاکر، اشوک ہاؤس، سی۔59، (ویسٹ) جنگ پورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی۔110014**

''اردو دنیا'' کا دسمبر 2006 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسب معمول یہ صورت اور سیرت دونوں پہلوؤں سے ایک سوغات ہے۔ اس میں صحافت کا گوشہ جو صرف ایک ہی مضمون پر مشتمل ہے، خاصے کی چیز ہے۔ جناب جی. ڈی. چندن نے مولوی محمد باقر کو قومی صحافت کا معمار اول قرار دیا ہے، ان کا یہ تجزیہ بہت جاندار ہے۔

مولوی محمد باقر کے پاس مطبوعہ صحافت کے فن کی کوئی روایت نہیں تھی۔ صرف اپنے پیش رو قلمی وقائع نگاروں کا جذبہ اور وطن دوستی کا نظریہ تھا۔ اپنے سیاسی مزاج کی آسودگی کے لیے انھوں نے اپنے دور کے مختلف الخیال دانشوروں سے رفاقت رکھی۔ ان میں ماسٹر رام چندر نمایاں تھے۔

چندن صاحب کے مضمون سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ملک کے لیے قوم کا تصور سب سے پہلے ایک اردو صحافی نے پیش کیا۔ اس انکشاف سے حصول آزادی کے بعد بعض کوتاہ نظر حلقوں کی طرف سے اردو صحافت کو وطن دشمن کہنے والوں کی افترا پسندی بے معنی ہو جانی چاہیے اور انھیں اپنے گناہ آسودہ کلمات کا پرائشچت کرنا چاہیے۔

جناب چندن کے مضمون میں 1857 کی تاریخی بغاوت کے پس منظر کے بارے میں بھی کئی نئے حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں ہمیں یہ پڑھایا گیا تھا کہ 1857 کی بغاوت کارتوسوں پر چربی کی غلط افواہوں پر مبنی ہندوستانی سپاہ کی سرکشی تھی۔ اب آپ کے شائع کردہ تحقیقی مضمون نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ساری خرابی کی جڑ کمپنی حکام کی ذہنیت تھی۔ ان کی رعونت نظم و نسق کی نالائقی اور ہندوستان کے علاقائی ناظموں کے خلاف سازشیں۔ اس ذہنیت کا نوٹس سب سے پہلے قلمی وقائع نگاروں نے کیا اور کمپنی کی ہندوستان دشمن سرگرمیوں سے برہم ہو کر 18ویں صدی کے اواخر ہی میں اپنی آزاد قلمی صحافت رائج کی جس کے لیے انھوں نے کسی حکام سے کسی اجازت کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ کتابت اور طباعت کی آسانیوں کی غیر موجودگی کے باوجود ان گنت قلمی اخبار نکالے۔ چندن صاحب کی دریافت کی داد دیتے ہوئے میں ان کی اس تجویز کی حمایت کرتا ہوں کہ ان قلمی وقائع نگاروں کے کام کی جامع تاریخ مرتب ہونی چاہیے۔

چندن صاحب کے مضمون سے یہ بھی پتہ چلا کہ کمپنی کے حکام نے بغاوت کے خلاف اپنے اشتہار میں کارتوسوں پر گائے کی چربی لگانے کا کھلا اعتراف کیا اور ''ہندو مسلم کارڈ'' اچھالتے ہوئے مسلم سپاہ کو بغاوت سے الگ ہو جانے کو کہا۔ یہ خباثت کی حد تھی۔ یہی ہندو مسلم کارڈ کھیل کر انھوں نے پلاسی کی جنگ جیتی اور اس کھیل کے پیچھے خود کمپنی کا ایک گورنر تھا۔

■ **پران کھلا، پوسٹ باکس 5235، چانکیا پوری، نئی دہلی۔110021**

شمس الرحمن فاروقی صاحب کا کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' جو شمارہ ماہ نومبر سے شروع ہوا ہے قابل ستائش ہے۔ ایسے کالم کی بہت ضرورت تھی۔ زبان میں خامیاں پیدا ہوتی ہیں جب الفاظ کو بولنے کی سہولت کے لیے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ یا پھر مہمل بنا دیا جاتا ہے وہ بھی روزمرہ کے استعمال میں ایسی غلطیوں کی نشان دہی ہونی چاہیے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں۔

دہلی سے میرٹھ جاتے ہوئے غازی آباد سے آگے سڑک کے کنارے ہورڈنگ لگے نظر آتے ہیں۔ جن پر لکھا ہے ''جین کی مشہور شکنجی'' جین شکنجی کی دکان لودی نگر میں ہے۔ جہاں لوگ سکنجبین پینے کے لیے رکتے ہیں۔ شکنجی سکنجبین کی بگڑی شکل ہے۔

ٹی. وی. پر ایسے اردو کے الفاظ سننے کو ملتے ہیں۔ جن کو اصل سے بگاڑ لیا گیا ہے۔ ٹی. وی. اینکر کو کہتے سنا ہے، وہاں لوگوں کا جماوڑا لگا ہوا تھا، جماوڑا مجمع کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

''اردو دنیا'' میں بہت اچھا، بہت دلچسپ۔ معلوماتی مواد ہوتا ہے۔ اس کی باقاعدگی بھی قابل تعریف ہے۔ اب تو اس کی اپنی پہچان بن گئی ہے۔ اس مقام تک لانے کے لیے ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

■ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈومن پورہ۔ کساری، مئوناتھ بھنجن (یو. پی.) 275101

ماہنامہ ''اردو دنیا'' بابت ماہ دسمبر کا ہدست ہوا۔ سبھی مشمولات اہم، معلوماتی اور کارآمد ہیں اور رسالہ حسب معمول صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے دقیع اور معیاری ہے۔ دراصل اس رسالے کا انفرادی مزاج و معیار ہی اس کی خاص شناخت اور مقبولیت کا سبب بھی ہے۔

زیر نظر شمارے میں نجی اسکولوں کی تاجرانہ پالیسی پر دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے اور گانگولی کمیٹی کی رپورٹ کے تناظر میں آپ نے بروقت اداریہ تحریر فرما کر قابل ستائش کام کیا ہے۔ اہل علم کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کوئی تجارت نہیں ہے بلکہ یہ نسل در نسل علم و آگہی منتقل کرنے کا انسانی مشن ہے اور اس کی یہی حیثیت برقرار رہنی چاہیے کیونکہ صلاحیت اور اہلیت کسی مخصوص طبقے، جماعت یا اہل ثروت کے لیے مختص نہیں ہے اور جب تک حصول تعلیم کے یکساں مواقع عام نہیں ہونگے بنی نوع انسان کی مثبت اور ہمہ جہت ترقی ممکن نہیں ہو سکے گی لہٰذا عوام خصوصاً غریب اور پڑھے لکھے لوگوں کو اس بارے میں بیدار رہنے کی ضرورت ہے نہیں تو بعض لوگ اپنے اثر و رسوخ اور دولت و ثروت کے بل بوتے پر سیاست کی طرح پورے تعلیمی نظام کو ہی ہائی جیک کر لینے کی فکر میں ہیں۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' اچھا سلسلہ ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ ''نصاب کی تیاری: چند رہبر اصول'' میں سید صفی اللہ نے بڑی کارآمد باتیں اٹھائی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نصاب ترتیب دیتے وقت نہ تو طلبہ کی ذہنی صلاحیت، حالات و ماحول اور علاقائی نزاکت کا خیال رکھا جاتا ہے نہ ان کی طبعی ضرورتوں اور نفسیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ ہی سائنٹفک طریقہ اپنایا جاتا ہے جس سے پورا نصاب طلبہ کے لیے پریشانیوں کا باعث بن جاتا ہے اور اس سے طلبہ کو جو تعلیمی فائدہ پہنچنا چاہیے وہ کم ہی پہنچتا ہے۔ ''ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی صورت حال'' عبدالعلیم قدوائی کا اچھا مضمون ہے موصوف ہماری موجودہ تعلیمی صورت حال پر بڑی باریک بیں نظر رکھتے ہیں اور مختلف ریاستوں کے اعداد و شمار کی روشنی میں ابتدائی تعلیم کا عرق ریزی سے جو تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ ''طلبہ کے لیے عملی زندگی میں رہنمائی'' سید محمد عمیر کا اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے کافی کارآمد مضمون ہے اس کے علاوہ ''دیہی اور زرعی کھادتیں، سائنس کی کسوٹی پر'' اقبال محی الدین، ''اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح'' مجتبیٰ حسین، بھی اچھی نگارشات ہیں۔

■ ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، بستی جرولی، پوسٹ کٹاواں، سلطان پور (یو. پی.) 228001

ماہنامہ ''اردو دنیا'' نومبر 2006 موصول ہوا۔ محترم شمس الرحمٰن فاروقی، روپ کرشن بھٹ، رضوان رضوی، وہاب قیصر، مشتاق احمد اور شفیع مشہدی کے مضامین از حد معلوماتی اور پر مغز ہیں ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ امید کہ یہ سلسلہ قائم رہے گا۔

■ حامد انور، گھر کا اسکول، کانٹا ٹولی چوک، اولڈ ایچ. بی. روڈ، شانتی نگر، رانچی۔

ماہ نومبر کا اردو دنیا دیکھا۔ یہ رسالہ بہت عمدہ ہے اور معلومات سے پر ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ اس مضمون سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا اور میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس سلسلے کو برابر جاری رکھیے۔ اس سے طالب علموں اور عام اردوداں دونوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ ''ہندوستان میں اردو کی صورت حال'' از آر. کے. بھٹ بھی ایک اچھا جائزہ ہے۔ فاخر شہیر عباسی نے ترجمہ بھی رواں دواں کیا ہے۔ ''بچوں کی تربیت میں اساتذہ کا کردار'' استادوں کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ رضوی صاحب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ استادوں کے قول و فعل سے کسی بچے پر منفی اثر نہ پڑے اس کی برابر کوشش کرنی چاہیے۔ افتخار الزماں کا مضمون ''جواہر لال نہرو اور بچے'' عمدہ مضمون ہے۔

■ شکیل شافل، ڈویژنل آرگنائزر انجمن ترقی اردو ترہٹ ڈویژن، حاجی مارکیٹ، باراچکیا، مشرقی چمپارن، بہار۔ 845412

نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ اس کا سرورق عید اور دیوالی کی خوبصورت تصویروں ہندوستان کی کثیر ثقافتی اور گنگا جمنی تہذیب و تمدن کی عظیم روایتوں کی بخوبی عکاسی کر رہا ہے۔ فکر انگیز اور دیدہ زیب سرورق دیکھ کر ہی کسی کتاب یا رسالے کی طرف قاری متوجہ ہوتا ہے۔ اس فن میں آپ کو کمال حاصل ہے۔

نئی دہلی میونسپل کارپوریشن نے بچوں کو بہتر تعلیم فراہم کرانے اور اساتذہ کی اہلیت کا اندازہ لگانے کے لیے جو پیش رفت کی ہے وہ قابل تحسین و تقلید ہے۔ میں مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ سے گزارش کرتا ہوں کہ اس اہلیتی جانچ کو پورے ملک میں نافذ کیا جائے اور مدرسوں میں اس کا خصوصی نظم ہو۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کالم کافی معلوماتی ہے اور اس سے اردو کے طلبہ و اساتذہ کے ساتھ نئے قلمکاروں کو نئی روشنی ملے گی۔ ہندوستان میں اردو کی صورت حال، کافی اہم اور فکر انگیز تحریر ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد کا

مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد کی عصری معنویت'' ہمیں باہمی محبت اور بھائی چارے کی دعوت دیتا ہے۔

■ **محمد ابراہیم صدیقی، حسن منزل اٹلیو، الہ آباد۔211003**

نومبر کے شمارے میں اگر نجیب محفوظ پر تبصرہ امریتا پریتم کے افسانہ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے کالم کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی رسالہ بھرپور تھا۔ سرورق پر دیوالی اور عید کے تعلق سے تصاویر جنت نگاہ ہیں۔ ''رشید امجد سے گفتگو'' اور افتخار الزماں کا جواہر لال نہرو پر مضمون بھی خوب ہیں۔ محترم فاروقی صاحب کی رسالے میں شمولیت ایک نیک فال ہے۔ موصوف کی تحریریں کسی بھی جریدے کے لیے وجہ افتخار اور سبب معیار بن جاتی ہیں۔

■ **محمد ناظم احمد، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش۔**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (دسمبر 2006) کو موصول ہوا۔ زیر نظر شمارے کے مشمولات میں مجتبیٰ حسین سے گفتگو جو فیروز عالم نے کی ہے۔ اسے پڑھ کر ان کی ادبی زندگی کے تعلق سے آگاہی حاصل ہوئی۔ حیدرآباد اور دلی کی زندگی کے واقعات قاری کے لیے دلچسپ بھی ہیں اور ایک درس بھی دیتے ہیں۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا ''اچھی اردو: روزمرہ محاورہ، صرف'' نہ صرف ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے بلکہ عام قاری کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ انھوں نے لفظوں کے صحیح یا غلط ہونے اور ان کے املا کے بارے میں اہم نکات پیش کیے ہیں۔ تلفظ اور املا کے مسائل پر رشید حسن خاں صاحب نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ سید صفی اللہ صاحب نے نصاب کی تیاری کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں، وہ توجہ طلب ہیں۔ جی. ڈی. چندن صاحب کا مضمون ''قومی صحافت کا معمار اول۔ مولوی محمد باقر'' بہت جامع اور تحقیقی ہے۔ سائنس اور معاشیات پر مبنی مضامین بھی عمدہ ہیں۔ گوشۂ باقر مہدی میں باقر مہدی پر مضامین عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔

□□□

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ بھی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات:83، قیمت:-/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر وادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر وادب کے مطالعے سے خوداعتمادی، جوش اور اپنے ملک وتہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی وعلمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات:105، قیمت-/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110 066

ہماری بات

قارئین کو نیا سال مبارک۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس شمارے کے ساتھ "اردو دنیا" اپنی اشاعت کے نویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ یکم اپریل 1996 کو ترقی اردو بیورو کی تنظیم نو کے بعد جب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ملک میں اردو زبان و تعلیم کے فروغ کی ذمہ داری سنبھالی تو اس کی کارگزاریوں اور منصوبوں سے اردو داں طبقے کو روشناس کرانے کے لیے "اردو دنیا" کو نیا رنگ و آہنگ دیا گیا۔ اس میں ابتداءً قومی اردو کونسل سے متعلق خبریں اور مطبوعات پر تبصرے شائع کیے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس میں اردو سے متعلق خبروں کو جگہ دینے کے ساتھ ساتھ مختلف سائنسی، عصری، سماجی، تکنیکی اور تاریخی موضوعات پر مضامین کی اشاعت کو اولیت دی جانے لگی۔ بعض قارئین کی جانب سے یہ شکوہ کیا گیا کہ اس رسالے میں شعر و ادب کو جگہ نہیں دی جاتی۔ دراصل ہماری سوچ یہ رہی کہ شعر و ادب کی اشاعت کے لیے ملک میں بہت سے رسائل ہیں لیکن اردو میں ایسا کوئی رسالہ نہیں ہے جو سائنسی، سماجی، تاریخی اور تکنیکی موضوعات پر قارئین کو مواد بہم پہنچائے۔ اس لیے ہم نے ان موضوعات کو اولیت دی۔ لیکن شعر و ادب کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔ گوشۂ ادب میں ہم ہر ماہ کوئی اہم شعری یا نثری تخلیق پیش کرتے ہیں، نیز متعدد ادبی شخصیات پر گوشے بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ عصمت چغتائی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، آر. کے. نارائن، کیفی اعظمی، نثار احمد فاروقی، بھیشم ساہنی، ملک راج آنند، رشید حسن خاں، احمد ندیم قاسمی، خورشید الاسلام، عبدالمغنی اور باقر مہدی پر "اردو دنیا" کے گوشے بے حد پسند کیے گئے اور ان میں سے بعض گوشوں (مثلاً نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں، بھیشم ساہنی، احمد ندیم قاسمی اور باقر مہدی) کو حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ پچاس صفحات پر مشتمل گوشۂ احمد ندیم قاسمی کے مضامین نہ صرف ہند و پاک کے متعدد رسائل نے نقل کیے بلکہ انٹرنیٹ پر ایک نیٹ میگزین samt.ifastnet.com (مدیر: اعجاز عبید) نے یہ پورا شمارہ "اردو دنیا" کے شکریے کے ساتھ پیش کیا۔

ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ "اردو دنیا" میں ہر موضوع پر معلوماتی، معیاری اور غیر متنازعہ مضامین شائع کیے جائیں۔ اس لیے ہم انگریزی یا ہندی رسائل اور اخبارات سے مفید مضامین کے تراجم یا کسی اردو رسالے سے کسی مضمون کو نقل کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ یہ امر ہمارے لیے باعث اطمینان رہا ہے کہ ہماری یہ کوشش پسند کی گئی ہے اور ہند و پاک کے مختلف رسائل اور اخبارات "اردو دنیا" کے مضامین نقل کرتے رہے ہیں۔

"اردو دنیا" کو مقبول خاص و عام رسالہ بنانے میں سب سے زیادہ معاونت ہمارے معزز و محترم قلم کار حضرات کی رہی ہے۔ اگر وہ اپنے وقیع اور معلوماتی مضامین کی اشاعت کے لیے "اردو دنیا" کا انتخاب نہ کرتے تو اسے آج پندرہ ہزار سے زیادہ تعداد اشاعت والا رسالہ بننے کا فخر حاصل نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی برصغیر ہند و پاک کے علاوہ امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، روس، خلیجی ممالک اور دنیا کے ان دیگر ممالک میں یکساں مقبولیت حاصل ہوتی، جہاں اردو پڑھنے والے موجود ہیں۔ بعض اوقات ہمیں کچھ مضامین واپس بھی کرنے پڑتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی ہم قلم کار حضرات سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ "اردو دنیا" کے معیار اور مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر اپنی کوئی تحریر ہمیں ارسال کریں تو اس کی اشاعت پر ضرور غور کیا جائے گا۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ عصری حالات و معاملات سے قارئین کو بروقت واقفیت حاصل کراتے رہیں۔ ہم ہر ماہ ادب، صحافت، ثقافت یا تعلیم و تدریس سے وابستہ کسی اہم شخصیت سے گفتگو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد اس شخصیت کی کارگزاریوں اور خدمات سے قارئین کو روشناس کرانا ہوتا ہے۔ بچوں کے گوشے میں ہر ماہ کونسل کی شائع کردہ کسی کتاب سے کوئی کہانی، نظم، ڈراما یا مضمون پیش کرنے کے علاوہ بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہن و عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی موضوع پر تازہ اور غیر مطبوعہ تحریریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ہماری خصوصی توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ اس تحریر سے بچوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے، اچھی عادتیں سیکھنے، آگے چل کر ایک ذمہ دار شہری بننے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ قومی اردو کونسل کی خوش نصیبی ہے کہ اسے جناب شمس الرحمٰن فاروقی جیسا وائس چیئرمین میسر آیا۔ ہم نے نومبر 2006 سے "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" کے عنوان سے ایک نیا کالم بھی شروع کیا ہے جس کے تحت اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالوں کے جوابات دینے کی ہماری گزارش محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے قبول کر لی ہے۔ یہ کالم بہت پسند کیا جا رہا ہے اور بہت سے قارئین سوالات بھیج رہے ہیں جن کے مفصل جوابات دیے جاتے ہیں۔ ابھی ہمیں "اردو دنیا" کے ایک قاری جمیل الرحمٰن صاحب (ضلع بردوان، مغربی بنگال) کا خط موصول ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"اردو دنیا" میں اردو روزمرہ کا کالم شروع کر کے آپ نے ہم طالب علموں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ اچھی اردو لکھنے میں بہت معاون ہے۔"

ہمیں محترم مخمور سعیدی (جو کونسل میں بطور مشیر خدمات انجام دے رہے ہیں) کا گراں قدر تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ دونوں شجر سایہ دار ہمیں طویل مدت تک میسر رہیں اور ہم ان کی رہنمائی میں قارئین "اردو دنیا" کو "ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی" سے آشنا کرتے رہیں۔ اس شمارے سے مخمور سعیدی صاحب رسالے کے اعزازی مدیر کی ذمہ داری بھی سنبھال رہے ہیں۔

قارئین کی رائے ہمارے لیے ہمیشہ مقدم رہی ہے اور اسی لیے رسالے کا آغاز قارئین کے خطوط سے ہوتا ہے۔ جن میں ہماری کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی "اردو دنیا" کو آپ کا یہ تعاون حاصل رہے گا اور اسے مزید بہتر بنانے کے لیے آپ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

□□□

فیروز عالم

مرزا حامد بیگ سے گفتگو

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ عصر حاضر کے ممتاز ادیب، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کے افسانوی مجموعے: ''گمشدہ کلمات'' (1931)، ''تار پر چلنے والی'' (1984)، ''قصّہ کہانی' (1984)، ''گناہ کی مزدوری'' (1991)، ''حمیدہ کی کہانی''' (1992)، ''لاکر میں بند آوازیں''(ہندی)(2001)ہیں۔''افسانے کا منظر نامہ''(1981)، ''تیسری دنیا کا افسانہ'' (1982)، ''اردو اور صوفی ازم'' (1986)، ''مغرب سے نثری تراجم'' (1988)، ''اطالیہ میں اردو'' (1989)، ''اردو افسانے کی روایت'' (1991)، ''اردو کا پہلا افسانہ نگار'' (1992)، ''مصطفیٰ زیدی کی کہانی'' (1993)، ''مقالات'' (1994)، ''نرناری'' (1995)، ''نسوانی آوازیں'' (1996)، ''ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم''(1999)، ''اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ'' (1999)، ''عالمی کلاسیک'' لیکچرز (2000)۔ تنقیدی کتب ہیں اور ''عزیز احمد: کتابیات'' (1986)، ''کتابیات تراجم: علمی کتب'' (1986)، ''ترجمے کا فن: نظری مباحث'' (1987)، ''کتابیاتِ تراجم: نثری ادب'' (1987)، ''باغ و بہار'' نسخۂ کلکتہ (2004) تحقیقی کتب ہیں۔

آپ کو پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ 1984 برائے: ''قصّہ کہانی'' (پنجابی افسانے)، نیشنل بک کونسل آف پاکستان ایوارڈ 1991 برائے: ''گناہ کی مزدوری'' (اردو افسانے)، نیشنل بک کونسل آف پاکستان ایوارڈ 1993 برائے: ''مصطفیٰ زیدی کی کہانی'' (تنقید)مل چکا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے کی گئی گفتگو کے چند اقتباسات قارئین کی نذر ہے۔

سوال: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ خاندان، بچپن اور لڑکپن کا مختصر احوال؟

جواب: میرے پرکھوں کا تعلق ماورالنہر، ملک ترکستان سے تھا۔ جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں افغانستان سے مرزا حکیم کے حملوں کو روکنے کے لیے رجب 989ھ مطابق اگست 1581 میں قلعۂ اٹک کی بنیاد رکھی گئی تو میرے پرکھوں کو قلعۂ اٹک کی حفاظت اور انتظام و انصرام کے لیے ہندوستان بلا لیا گیا۔ ہم لوگ خواجہ زادہ مغل ہیں۔ میرے بزرگوں میں سے ایک مرزا محمد بیگ بہ عہد احمد شاہ (1748-1754) صوبیدار اٹک تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں المعروف نیز و رخشاں کے دادا مرزا عارف جاں بھی انھی دنوں اپنے دو بھائیوں قاسم جان اور عالم جان کے ہمراہ اٹک آ کر ہمارے مہمان ہوئے اور مرزا محمد بیگ کی دختر سے شادی کی۔ نیر درخشاں دہلوی کے والد احمد بخش خاں کی پیدائش (1765) اٹک کی تھی۔ یوں مالک رام کی تحقیق ''تلامذۂ غالب'' ہمارا ایک تعلق لوہارو خاندان سے ثابت کرتی ہے۔ ننھیال کی طرف سے میرا نسب غوث الزماں محمد یحییٰ اٹکی سے مل جاتا ہے۔

1581 کے بعد سے ہمارا وطن علاقہ چھچھ موضع گمالہ، تحصیل حضرو، ضلع کیمبل پور (حال: اٹک) ہے۔ عہد احمد شاہی کے صوبیدار اٹک (1750) مرزا محمد بیگ (میرے جد اعلیٰ) کی جاگیر کا بچا بچایا قدرے غیر آباد علاقہ، جس میں میری طرح کے ہٹ دھرم اور گنوار بستے ہیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن سندھ میں گزرا۔ میری پیدائش 29 اگست 1949 کھیم چند بلڈنگ کے ایک فلیٹ، علاقہ صدر کراچی کی ہے۔ وہ یوں کہ میرے والد محترم محمد اکرم بیگ نے جب کیمبل پور سے 1934 میں میٹرک پاس کر لیا تو انگریزوں سے جاگیر اور خطاب یافتہ سر محمد امین، رئیسِ شمس آباد، علاقہ چھچھ نے پنجاب کی انگریز عملداری میں ان پر سرکاری ملازمت کے تمام دروازے بند کروا دیے اور وہ مسلسل بے روزگاری سے تنگ آ کر سندھ پولیس میں بطور کانسٹیبل بھرتی ہو گئے۔

میری اوّلین یادیں قصبہ تھرڑی محبت، ضلع دادو (اندرونِ سندھ) کی ہیں۔ قریب ہی ایک نہر بہتی تھی اور دور تک آموں کے باغات کا ایک سلسلہ تھا اور میری دوپہریں گھماؤ غلیلوں سے ہریل طوطوں کو اڑانے میں گزرتی تھیں۔ ان دنوں اندرونِ سندھ ریڈیو کی نشریات پہلی بار بیٹری سے چلنے والے ریڈیو سے سنی جانے لگیں۔ 1955 میں وہاں سے تبدیل ہو کر میہڑ گئے جہاں سنیما میں پہلی فلم ''آبِ حیات'' (پریم ناتھ۔ مدھوبالا) دیکھی۔ اس کے بعد بالترتیب دادو، ماتلی، حیدرآباد، ہالہ، میرپور خاص، نواب شاہ اور سکھر میں رہے۔ بچپن میں والدہ سے پنجابی میں ''جنگ نامۂ زیتون'' اور ''جنگ امیر حمزہ'' سنتا رہا، جو انھیں زبانی یاد تھے۔ موسم گرما کی طویل دوپہروں میں چھت پر پتنگ اڑاتا یا

مصوری کرتا۔ مصوری میں میرے استاد شہزادو کے ماسٹر ورنیکل تھے۔ ان کی رہنمائی میں 1961 ہی میں میں نے ویسٹ پاکستان، ڈرائنگ ایگزامینیشن پاس کرلیا۔ یہ اس زمانے کے سندھی اخبارات کی ایک خبر بنی کہ بارہ برس کے لڑکے نے امتحان پاس کرلیا۔

سوال: اوائل جوانی، اپنے ہم جماعتوں اور اساتذہ کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: ابتدائی دو جماعتیں سندھی میڈیم سے پڑھیں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میرپور خاص میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، جب وہاں کے دو گلوکار بھائیوں مسعود رانا اور جاوید رانا اور پیرانی منزل چاکی پاڑہ کے رہائشی محمد یوسف جو ہم جماعت بھی تھے، سے قربت رہی اور 1965 کی پاک بھارت جنگ سے قبل ان کے ساتھ مل کر میں نے بیسیوں فلمیں دیکھیں۔ سہراب مودی کی ''جیلر''، دلیپ کی ''آن''، ''گھر کی عزت''، ''دیدار''، اشوک کمار کی ''بھائی بھائی''، پریم ناتھ کی ''بادل'' اور بہت سی۔ نواب شاہ (سندھ) سے میٹرک کرنے کے بعد سندھ مسلم آرٹس کالج، کراچی کے زمانۂ طالب علمی (67-1966) میں نذیر بیگ (اداکار ندیم) اور انور بیگ (ندیم کے چھوٹے بھائی) جو مصوّر تھے اور اسٹیج کے اداکار محمد ایوب کا ساتھ رہا۔ ندیم ان دنوں بطور گلوکار فلمی دنیا میں قدم جمانا چاہتے تھے لیکن جب فلم میں آئے تو بطور اداکار ان کی پہلی فلم ''چکوری'' پلاٹینم جوبلی کرگئی۔

اس زمانے میں، میں نے ایک میوزک اکیڈمی جوائن کی ہوئی تھی، جہاں سے پیانو اور بینجو بجانا سیکھا۔ اس کے بعد آرٹس کونسل کراچی کی مصوری کی کلاسز میں حاضری دی۔ میری، انور بیگ اور لئیق لطیف کی تصویروں پر مشتمل نمائش (1966) بہ اہتمام برماشیل کا افتتاح فیض احمد فیض مرحوم نے کیا تھا۔

8 جنوری 1969 کو ذوالفقار علی بھٹو کے استعفیٰ کے بعد ان پر انٹی کرپشن کا جھوٹا مقدمہ نہ بنانے کی سزا کے طور پر جب ڈی آئی جی سندھ نے میرے والد کی جواب طلبی کی تو انھوں نے ملازمت پر لعنت بھیجی اور بطور ڈی ایس پی قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر بہ عمر چھپن برس اپنے آبائی علاقے میں لوٹ آئے۔ میں نے جب گورنمنٹ کالج کیمبل پور سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں داخلہ لیا تو وہاں پر تخلیقی ذہن رکھنے والے بہت سے لڑکے ملے۔ شاعر شبیر شاہد، افسانہ نگار احمد جاوید، ڈراما نگار یونس جاوید اور شاعر ناصر بلوچ زوال ڈھاکہ کے بعد ادھر کا ایک نوجوان نقاد سراج منیر بھی لاہور آنکلا۔ ہم سب لوگوں نے حلقۂ ارباب ذوق، لاہور میں اپنی ابتدائی چیزیں پڑھیں۔ 1972 میں ایم اے (اردو) درجہ اوّل میں پاس کرنے کے باوجود میں نے فلمی دنیا میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر قسمت آزمائی کی۔ رحیم گل کو اسسٹ کرتے ہوئے ایک پشتو فلم ''موسیٰ خان گل مکئی'' بڑی مشکل سے مکمل کروائی اور دوبارہ لاہور کی سڑکوں اور فٹ پاتھ پر آگیا۔ 1974 میں لیکچرر ہوا اور 1986 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

سوال: ادبی زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟

جواب: میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا پر افسانہ لکھنے کی طرف مجھے ایک سابق بیورو کریٹ لائے۔ 1966 میں ہم لوگ نواب شاہ میں تھے اور میں میٹرک کا طالب علم۔ اسکول کے قریبی پارک میں ہی نوروز چندانی صاحب سے ملاقات ہوئی، اس وقت میں کرشن چندر کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ چندانی صاحب نے پوچھا: ٹیگور کو پڑھا ہے؟ تو میں چکرا گیا اس وقت تک میں نے پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار اور اے حمید وغیرہ کو پڑھ رکھا تھا۔ آمنہ لائبریری سے نسیم حجازی، ایم اسلم اور دت بھارتی کے ناول بھی پڑھ رکھے تھے پر ٹیگور کا نام میرے لیے نیا تھا۔

اگلے روز انھوں نے مجھے "The Hungry Stones" لادی۔ چند افسانے پڑھے اور 1966 میں ٹیگور کے رومانی افسانوں کی طرز پر ''ریل کا ڈبہ'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ اس کے بعد میں نے اپنی تنہائی کو افسانوں کی صورت میں لکھنا شروع کردیا۔ ٹیگور کے کچھ ترجمے بھی کیے۔

سوال: آپ کس اسکول سے وابستہ ہیں؟

جواب: میں فرانسیسی زوال پسند تخلیق کاروں سے بہت متاثر ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے Huysman نے اپنے ایک تخلیق کردہ افسانوی کردار اسنتی کے ساتھ بٹھا کر میری تربیت کی ہے۔ بنجمن پریٹ کو داد دیتے نہیں تھکتا، جس کی ایک لائین ہے: ''اپنی ماں کو اس وقت پیٹو جب وہ جوان ہو۔'' ہمارے یہاں یہ صورت صرف محمد علی ردولوی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔

سوال: پاکستان میں اردو سرکاری زبان ہے یا قومی زبان؟

جواب: برائے نام قومی زبان، اردو ہے اور عملی طور پر سرکاری و دفتری زبان انگریزی۔

سوال: آپ پریم چند سیمینار میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ اس حوالے سے بتائیے کہ افسانہ نگار کے لیے مطالعہ، مشاہدہ اور ذاتی تجربات کا ہونا کس تناسب سے ضروری ہے؟

جواب: دیکھیے، کوئی بھی کام کرنا ہو جیسے جوتے گانٹھنا، تو دیکھنا یہ ہوگا کہ ہم سے پہلے کس کس نے اور کیسے جوتے گانٹھے۔ یوں ڈاسن کے کام کا جائزہ بھی لینا پڑے گا اور مسٹر باٹا کے کام کا بھی۔ پھر یہ کہ معاصرین کا کام دیکھنا پڑے گا اور غور کرنا پڑے گا کہ اگر ہم ان جیسا ہی کام کرتے ہیں تو وہ ہمارے کرنے کا کام نہیں اور اگر اس سے ذرا بہتر کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے، کوشش کر دیکھیں۔ مطالعے اور مشاہدے کو تو میں رکھتا ہوں اس ذیل میں۔ رہ گیا ذاتی تجربہ، تو وہ ہے ہمارا خاص منطقہ۔ مطالعہ ہمیں اچھے اور خراب کام میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر پریم چند کا شاہ کار افسانہ ''کفن'' پڑھ لینے سے ہم پورے پریم چند تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس کے لیے ہمیں پورا پریم چند پڑھنا پڑے گا۔ تب ان کے بہت سے خراب کام میں سے ''دو بیل''، ''بڑے گھر کی بیٹی''، ''دودھ کی قیمت'' اور ''گلی ڈنڈا'' جیسے لاجواب افسانے بھی ہمیں پڑھنے کو مل جائیں گے۔ مشاہدے کی دو صورتیں ہیں، ایک اجتماعی، دوسرا شخصی۔ پہلی صورت تو یہ ہوئی کہ جیسا کچھ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر نے ہمیں اپنے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر دکھانے کا اہتمام کیا۔ اس کام کے مطالعے کے دوران ہمیں مشاہدے کا اشتراک دکھائی دے گا۔ کم و بیش ویسا کچھ ہم نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہوگا لیکن کچھ کونے کھدرے ایسے بھی تو ہوں گے جہاں تک ہماری رسائی ان کے ذریعے ہی ممکن ہوئی۔ اسی طرح ہمیں محسوس ہوگا کہ کچھ منطقے ان سے ان دیکھے رہ گئے۔ اگر ہم ایسے نادریافت گوشے دریافت کرنے اور ان کی پیش کش میں کامیاب ہو جائیں تو اس نوع کی رسائی ہم سے مخصوص رہے گی۔ مثال کے طور پر دیہات نگاری میں احمد ندیم قاسمی کے سون سکیسر کے علاقے سے متعلق ''لارنس آف تھلیبیا'' اور ''ثواب'' جیسے افسانے احمد ندیم قاسمی ہی لکھ سکتے تھے۔ اسی طرح ''گرہن'' جیسا افسانہ راجندر سنگھ بیدی کے سوا کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ افسانہ ''کارمن'' قرۃ العین حیدر ہی لکھ سکتی تھیں۔

سوال: آپ کے افسانوں کی بابت حقیقت پسندانہ ہونے کا تاثر کہاں تک درست ہے؟

جواب: میرے بہت سے افسانوں میں آپ کو حقیقت پسندانہ اپروچ بھی ملے گی جیسے افسانہ ''گنڈ کا محراب ساز''، ''کاتک کا ادھار''، ''صید زبوں''، ''بابے نور محمد لے کا آخری کبت''، ''جانکی بائی کی عرضی'' اور ''لالہ جسونت کی حویلی'' میں، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوگا کہ حقیقت یکا یک تجرید میں ڈھل گئی، جیسے ''گنڈ یاں لائن'' اور ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' یا ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'' میں، پھر کچھ افسانے تجریدی بھی ہیں جیسے ''دھوپ کا چہرہ'' اور کچھ علامتی بھی جیسے افسانہ ''زمین جاگتی ہے'' یا افسانوی مجموعہ ''گناہ کی مزدوری'' کے بیشتر افسانے۔

سوال: بالخصوص ''گمشدہ کلمات'' کے حوالے سے آپ پر نوسٹلجیا کا شکار ہونے کا الزام کس حد تک درست ہے؟

جواب: بے شک میرے افسانوں میں نوسٹلجیا موجود ہے اور میرے تخلیقی عمل میں پیش قدمی کے وقت وہ، لشکر کے میمنہ یا میسرے کے طور پر آگے بڑھتا ہے لیکن میرے تخلیق کردہ کرداروں کے دکھ، ہٹ دھرمی یا غصہ میرا نہیں، میرے بزرگوں کا ہے۔ جس کا جنم میرے اجتماعی لاشعور سے ہوا۔ میرے افسانوں میں موجود نوسٹلجیا کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے، محض ایک ہجرت کے تجربے تک محدود نہیں۔ میں اپنے پیچھے رہ گئے گلی محلے یا بزرگوں کے مدفن یاد نہیں کرتا۔ میرے افسانوں کا نوسٹلجیا تہہ در تہہ کئی بیتے زمانوں سے متعلق ہے۔ شاید ماوراءالنہر سے متعلق بھی جب کہ ملک ترکستان اور حالیہ ازبکستان کا وہ علاقہ میں نے تاحال نہیں دیکھا، جو میرے بزرگوں کا وطن تھا۔ اور جہاں سے نکلے ہمیں چار سو سال ہو گئے۔

سوال: کیا طویل جملے آپ شعوری طور پر وضع کرتے ہیں؟ آپ کے افسانوں کی یہ ایک الگ پہچان ہے؟

جواب: یہ سوال غور طلب ہے کہ تخلیقی نثر لکھنے کے حوالے سے زبان دانی کا معیار کیا ہے؟ اور وہ کسوٹی کیا ہوگی جس پر کس کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون شخص زبان داں ہے اور کون نہیں؟ اس ضمن میں جانچ پرکھ کا معیار جداگانہ ہے۔ شاعری میں الگ اور نثر میں الگ۔ جن میں سے ایک معیار یہ بھی ہے کہ کون ہے جو پوری اسلوبیاتی روایت سے آگاہ ہے اور متواتر زبان کی نزاکتوں پر نظر رکھتے ہوئے اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق و مزاولت بہم پہنچاتا ہے؟ اس حوالے سے بڑا نثر نگار وہی شمار کیا جائے گا جو طویل اور پیچیدہ جملے لکھنے پر قادر ہو ''لیکن''، ''اور''، ''اگر'' وغیرہ لگا کر نہیں۔ ہمارے ہاں ''چھوٹے چھوٹے'' اور ''رواں جملوں'' کی تحسین بے جا نے بڑے نثر نگار پیدا نہیں ہونے دیے جب کہ عالمی ادب میں اسی خوبی کے پیش نظر فرانسیسی ناول نگار ستاں دال کے ناول ''سرخ و سیاہ'' ("The Scarlet and Black") کے بارے میں ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ اس ناول کی نثر کا مرتبہ شاعری سے بھی بلند ہے۔ بالخصوص طویل جملے وضع کرنے کے ضمن میں ستاں دال سے بھی بہتر امثال ہمیں گستاؤ فلابیئر کے ناول "Madame Bovary" میں مل جاتی

ہیں۔ اردو ادب میں اس نوع کا کام کرنے والوں کا شمار ایک ہاتھ کی انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں ایک نام تو میں اپنے دادا استاد محمد حسن عسکری کا لوں گا۔ ان سے پہلے محمد علی ردولوی نے یہ کام کیا۔ اس خصوص میں قاضی عبدالستار کا نام بھی نمایاں ہے۔ یہ تو ہوئے اردو فکشن کے گریٹ ماسٹرز۔ اس ضمن میں اس فقیر نے بھی کوشش تو کی ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اردو فکشن کا ناقد، خواب گراں سے کب جاگے اور اس حوالے سے کوئی بات کرے۔

سوال: کیا آپ کی کہانی موضوع کے بجائے بکھرے ہوئے امیجز کا مجموعہ ہے؟

جواب: یہ وہی کہہ سکتا ہے جس نے ''لالہ جسونت کی حویلی''، ''جانکی بائی کی عرضی''، ''کالی زبان''، ''کاتک کا ادھار'' اور ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' جیسے افسانے نہیں پڑھے۔ بے شک، میرے متعدد افسانوں میں امیجز کا استعمال ہوا ہے جیسے افسانہ ''دل کے موسم''، ''دھوپ کا چہرا'' اور ''سونے کی مُہر'' لیکن ان افسانوں کا زمانۂ تحریر 1974 سے قبل کا ہے جب اس نوع کے افسانے کوئی لکھتا نہیں تھا۔ سریندر پرکاش نے البتہ اسی دور میں افسانہ ''کاٹی ہوئی لکڑیاں'' لکھا تھا اور ہمارے ناقدین نے اس افسانے کو بھی بکھرے ہوئے امیجز کا افسانہ قرار دیا تھا۔

سوال: کیا آپ کے بارے میں اس رائے کو درست تصور کر لیا جائے کہ آپ تکنیک کے ذریعے ادب میں داخل ہوئے؟ ہمارے قارئین آپ کی تکنیک اور اس کے ماخذ کی بابت جاننا چاہیں گے؟

جواب: بے شک، افسانہ ''زمین جاگتی ہے''، ''ایکٹ''، ''یادگار محفوظ'' اور ناولٹ ''تار پر چلنے والی'' موضوع کی نہیں تکنیک کی مثالیں ہیں۔ سجاد باقر رضوی نے ''گم شدہ کلمات'' میں شامل افسانے پڑھ کر یہ رائے قائم کی تھی، جب کہ اس سے قبل وہ انتظار حسین کی کتاب ''آخری آدمی'' کا دیباچہ لکھ چکے تھے۔ یہ بات انھوں نے انتظار حسین کے بارے میں نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ داستان اور صوفیانہ ملفوظات سے اخذ کردہ تکنیک تو معلومہ تکنیک تھی، جس کے بہترین نمونے ''باغ و بہار''، ''توتا کہانی''، ''آرائش محفل''، ''قصۂ گل وصنوبر''، ''مذہب عشق'' اور ''فسانۂ عجائب'' میں بکھرے پڑے تھے۔ جب کہ ''گم شدہ کلمات'' میں شامل مغل تہذیبی پس منظر کے حامل افسانوں میں ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں بالخصوص سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، خالدہ اصغر اور بلراج کومل کے باہم متحارب تکنیکی تجربات سے حاصل کردہ نتائج کے ساتھ ساتھ میری سینما بینی اور مصوری کے دیرینہ تجربے کے ساتھ فلم میکنگ کا عملی تجربہ بھی شامل تھا۔ میرے افسانوں میں یہ ایک طرح سے ردِعمل تھا اس بندھے ٹکے فارمولا افسانے کا، جو ہم سے پہلے لکھا گیا اور اس افسانے کی تعریف میں ہمارے بیشتر ناقدین رطب اللسان رہے۔ اس ضمن میں وضاحت کے لیے یہی کہہ سکتا ہوں کہ راجندر سنگھ بیدی کے دو افسانے: ''جوگیا'' اور ''سونفیا'' کے ادغام سے اتنی طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم کاغذ پر قلم سے رنگ بکھیر کر پینٹنگ بنا سکتے ہیں اور بیدی ہی کے دو افسانے ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' اور ''ایک رات اقیم چورستے کے پاس کیا ہوا'' کے ادغام سے عبدالرحمن چغتائی، شاکر علی اور ایف۔ حسین کے مقابل کی تصویریں بنائی جا سکتی ہیں۔ میں نے افسانے لکھتے ہوئے قدیم وجدید حقیقت پسند اور تجریدکار پینٹرز بالخصوص شاکر علی، احمد پرویز، انور جلال شمزہ اور منصور راہی کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھا اور کیمرے کی آنکھ کو بھی استعمال کیا۔ پھر یہ کہ ایڈیٹنگ بڑی اہم چیز ہے۔ اپنے لکھے کو بار بار کاٹنا، ایک مشکل کام ہے لیکن اچھے اور خراب کام میں وہی فرق کا باعث بنتا ہے۔

سوال: آپ شہزادہ داراشکوہ کے اتنے مداح کیوں ہیں؟

جواب: شہزادہ داراشکوہ مقتول میرا آئیڈیل ہے۔ وہ مذہبی کٹر پن اور تنگ نظری کے مقابل آزاد خیالی اور علم کا استعارہ ہے۔ بابر سے شاہ جہاں تک مغل فرماں رواؤں نے ہندوستان میں بلاتفریق مذہب وملت ہندوستان میں جو بھائی چارے کی فضا قائم کی تھی، اس کا تسلسل داراشکوہ ہی قائم رکھ سکتا تھا۔ اس خطے کی یہی ضرورت تھی جسے ہم آج محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ داراشکوہ کے نام کیا۔

سوال: آپ نے کن کن روایات سے کن اسباب کی بنا پر انحراف کیا؟

جواب: روایت سے بغاوت کی بات 1972 میں ہی منیر نیازی نے حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور کے ایک اجلاس میں میرا ایک افسانہ ''افسانہ و افسوں کی حشیشی رات'' سن کر کہی تھی۔ میرے خیال میں لفظوں کو ان کے مروج معنی میں برتنا کوئی دانشمندی نہیں۔ کہانی پن کی آرزو میں متقدمین کی پیروی کرنا اور اپنی نفسی کیفیات کو دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں میں تعمیر کرنا انجماد کی علامت ہے۔ ایسا کام کرنے سے بہتر ہے کہ نہ کیا جائے اور جو لوگ محض عادت کے تحت لکھتے ہیں، وہ کتنے دن جی لیتے ہیں؟

سوال: آپ پر مشکل پسندی کا الزام کن لوگوں کی جانب سے لگا اور کیوں لگایا گیا؟

جواب: یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ میں مشکل پسند ہوں اور ابتدا ہی سے تربیت

یافتہ قاری کے لیے لکھتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سادہ بیانیہ کا عادی قاری میرے لکھے کو مبہم قرار دیتا رہا۔ اس میں قصور معصوم قاری کا نہیں، ہمارے ناقدین کا ہے۔ جنھوں نے قاری کی تربیت کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ ہمارے یہاں محمد حسن عسکری کے بعد گنے چنے ناقدین ہی ایسے ہیں جنھوں نے شارح کا فریضہ بھی ادا کیا جیسے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، فضیل جعفری، وارث علوی اور مہدی جعفر۔ البتہ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنا کیا، وہ کم ہے۔ وہ بہت زیادہ کام کر سکتے تھے۔ سلیم احمد اور شمیم احمد نے ایک آدھ افسانہ نگار کے علاوہ افسانہ پڑھا ہی نہیں۔ وزیر آغا نے سب سے زیادہ نئے پرانے افسانہ نگاروں کو پڑھا لیکن کلیہ سازی کرتے ہوئے اس کا انطباق کم لوگوں پر کیا۔ ریاض احمد اور افتخار جالب زیادہ وقت گوشہ نشیں رہے۔ جمیل جالبی تحقیق کی طرف نکل گئے اور جیلانی کامران لسانی تشکیلات سے باہر نہ نکل سکے۔ مظفر علی سید اس خصوص میں عمدہ کام کر سکتے تھے لیکن مجلسی تنقید زیادہ کی اور لکھا کم۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معصوم قاری محض سادہ بیانیہ افسانے سے جڑا رہا۔ اس کے لیے مرزا حامد بیگ ہی کیا، اس سے پہلے کی نسل کے چیدہ افسانہ نگار جیسے سریندر پرکاش، بلراج مین را اور انور سجاد بھی مبہم ہی شمار کیے گئے۔ آج جس بیانیہ افسانے کی پیٹھ ٹھپکی جا رہی ہے اس سے بہتر بیانیہ افسانہ کرشن چندر لکھ چکے ہیں۔ اب ہم ان کی تیار کردہ زمین میں کیا بوئیں گے اور کیا کاٹیں گے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا ہے جب کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ آج کا افسانہ زوال کا شکار ہے؟

جواب: عالمی معیار سے ناواقف لوگ ہی کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا ہے۔ میں نے عالمی معیار کے افسانوں کی انتھالوجیز دیکھی ہی نہیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں سے چند افسانوں کو اردو دنیا سے متعارف بھی کروایا ہے یہ سوچ کر کہ لوگوں کو پتا چلے کہ عالمی معیار ہوتا کیا ہے؟ ایک افسانے کا ترجمہ تو مظفر علی سید مرحوم کے اس پروجیکٹ کے لیے کیا تھا جسے ''افکار'' کراچی کے خاص نمبر کی صورت میں شائع ہونا تھا۔ وہ افسانہ تھا ایبو سے گول کا ''زندگی حسین ہے'' اور افسانہ نگار کا تعلق ہے سیرالیون سے۔ اتنے چھوٹے سے پس ماندہ ملک کا اتنا بڑا افسانہ نگار۔ دوسرا افسانہ تھا عالم شاہ خاں کا، جسے میں نے ہندی سے خود ان کی مدد سے ترجمہ کیا۔ عنوان تھا ''کرائے کی کوکھ'' ان دو افسانوں کو پڑھ کر کون کہے کہ ہم ان جیسا افسانہ لکھ لیتے ہیں۔ اردو افسانہ زوال کا شکار ہے یا نہیں تو اس ضمن میں عرض ہے کہ 1940 تا 1960 کی درمیانی مدت بے شک اردو افسانے کے سنہرے دن تھے جب راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، غلام عباس، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی نے شاہ کار افسانے تخلیق کیے۔ ان سنہرے دنوں کا مقابلہ صرف 1980-1960 کی درمیانی مدت سے کیا جا سکتا ہے۔ جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مین را، انور سجاد، بلراج کومل، خالدہ حسین، منشایاد، اسد محمد خاں، سلام بن رزاق، انور قمر، نیر مسعود، احمد داؤد، قمر احسن، غضنفر، علی تنہا، شوکت حیات اور ساجد رشید نے شاہ کار افسانے تخلیق کیے۔

سوال: ستر کے دہے کے بعد لکھا جانے والا افسانہ ناقدین کی توجہ سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ کیوں؟

جواب: اس کی ایک وجہ تو گزشتہ دو دہائیوں میں سامنے آنے والے افسانہ نگاروں کی ناتوانی ہے۔ بہت محتاط ہو کر بھی بات کریں تب بھی یہ کہنا پڑے گا کہ نئے آنے والے، ساٹھ اور ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں سے کچھ الگ کام کرنے میں ناکامیاب رہے۔ سوائے، سید محمد اشرف اور خالد جاوید کے۔ یوں حق میں لکھا جائے یا خلاف، زندگی کا ثبوت ہوتا ہے۔ اب نہ حق میں لکھا جا رہا ہے نہ خلاف۔ ہم لوگوں نے تو ستر کے دہے میں خوب گالیاں سمیٹیں۔ بہت کچھ لکھا گیا۔ ہمارے خلاف بھی اور حق میں بھی۔ ہمیں برا بھلا کہنے والوں میں اردو کے اہم نقاد بھی تھے اور احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی اور اشفاق احمد جیسے نمایاں افسانہ نگار بھی۔ ممتاز مفتی نے پنڈی گروپ کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ٹکڑے جوڑ کر ایک افسانہ تیار کیا اور ہم لوگوں کی موجودگی میں حلقۂ ارباب ذوق، اسلام آباد میں ہم سب کا مضحکہ اڑانے کی خاطر پڑھا بھی۔ عصمت چغتائی نے ہمارا مضحکہ ایک مضمون ''سانپ کے ٹکوے'' لکھ کر اڑایا۔ اشفاق احمد نے یہ کہہ کر افسانہ نگاری ترک کر دی کہ یہ لوگ جو لکھ رہے ہیں، اب ہم کیا لکھیں۔ اب نئے لوگ، کچھ نیا کر کے دکھائیں گے تو زیر بحث بھی آئیں گے۔ اختر انصاری اکبرآبادی نے ''نئی قدریں'' حیدرآباد سندھ کے خاص نمبر کے لیے مصطفی زیدی سے نیا کلام طلب کیا تو مصطفی زیدی نے انھیں جواب میں لکھا: ''بھائی، ہمارا تو پرانا ہو گیا۔'' میں بھی یہی کہوں گا۔ اب یہ نئے لوگوں کا مسئلہ ہے کہ ناقدین کو کس طور پر اپنے کام کی جانب متوجہ کرواتے ہیں۔

سوال: آپ کئی بار سیمینار میں شرکت کے لیے انڈیا آئے۔ اگر آپ سے

دونوں ملکوں کے تخلیقی ادب کے بارے میں رائے دریافت کی جائے تو آپ کیا کہیں گے؟

جواب: دونوں اطراف میں نمایاں کام کے حامل بزرگ قلم کار بہت کم رہ گئے ہیں۔ جو رہ گئے ہیں، انھوں نے افسانہ لکھنا چھوڑ دیا جیسے ہاجرہ مسرور، شوکت صدیقی، اے حمید، انور سجاد اور قرۃ العین حیدر، مین را اور قاضی عبدالستار ایک مدت سے افسانہ نہیں لکھ رہے۔ پاکستان کے متحرک افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، حسن منظر، مسعود اشعر، خالدہ حسین، اسد محمد خاں، رشید امجد، منشایاد، احمد جاوید اور علی تنہا ہیں۔ جب کہ بھارت میں جوگندر پال، اقبال مجید، سلام بن رزاق، قمر مسعود، حسین الحق، شوکت حیات، ساجد رشید، غضنفر، سید محمد اشرف اور خالد جاوید متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ یوں افسانے کی سطح پر تو دونوں اطراف کے پلڑے برابر دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کی صنف میں قرۃ العین حیدر کا جواب نہ پاکستان میں پہلے تھا، نہ اب ہے۔ ان کا موازنہ نہ تو خود بھارت ہی کے عالمی شہرت یافتہ ناول نگاروں وکرم سیٹھ اور ارون دھتی رائے سے بھی نہیں بنتا۔ مجموعہ ''پیتل کا گھنٹہ'' کے شاہکار افسانوں کے خالق قاضی عبدالستار کو تاریخی ناول کھا گیا۔ کاش وہ ''شب گزیدہ'' ہی کی لائین پر آگے بڑھتے لیکن تاریخ سے پہلو بچا کر۔ باقی ہندوستان اور پاکستان کے ناول نگار ایک ہی سطح کے ہیں۔ تنقید کے میدان میں بھارت کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا ہے۔ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، فضیل جعفری، وارث علوی، شمیم حنفی اور مہدی جعفر کا کام اہمیت کا حامل ہے۔ جب کہ پاکستان میں محمد حسن عسکری، سلیم احمد، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، مظفر علی سید اور شمیم احمد کے بعد ہم تنقید کے میدان میں بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ تحقیق کی سطح پر بھارت میں قاضی عبدالودود، مالک رام اور امتیاز علی عرشی کے بعد بھی بہت سے لوگ موجود ہیں۔ آپ کے ہاں تنویر احمد علوی جیسے بڑے محقق اب بھی متحرک ہیں جب کہ ہمارے ہاں جمیل جالبی کے عمدہ کام کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ غزل اور نظم کی دو اصناف ایسی ہیں جن میں پاکستان، بلاشبہ ہندوستان سے بہت آگے ہے۔ پاکستان کے منیر نیازی، احمد مشتاق، ظفر اقبال، شہزاد احمد، انور شعور، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، شاہدہ حسن، ابرار احمد، لیاقت علی عاصم، اجمل سراج، اختر عثمان، اقتدار جاوید، اکبر معصوم، احمد نوید، قمر رضا شہزاد اور گیت نگاری میں ناصر شہزاد کا جوڑ ہندوستان میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ بھگوان داس اعجاز البتہ مجھے پسند ہیں۔ ہندوستان میں شہریار، محمد علوی اور بشیر بدر کے بعد عرفان صدیقی جیسا صرف ایک اہم شاعر پیدا ہوا اور وہ بھی اٹھ گیا۔ آپ بیتی کی صنف کا انحصار لکھنے والے کی شخصیت کی اہمیت پر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان دنوں تہاڑ جیل سے متعلق افتخار گیلانی کی آپ بیتی زیر بحث ہے اور ہمارے یہاں احمد بشیر کی آپ بیتی ''دل بھٹکے گا'' یہ الگ قصہ ہے کہ احمد بشیر نے ''دل بھٹکے گا'' کو بطور ناول پیش کیا۔ باقی رہ گئیں سفرنامہ، ہائیکو، ماہیا وغیرہ اصناف تو ان میں بطور ادبی صنف کے دونوں اطراف میں نہ امکانات پہلے تھے، نہ اب ہیں۔ اسے ورزش محال کہہ لیں۔

سوال: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رشتوں کو بہتر بنانے کے لیے دونوں ممالک کے اہل قلم کس طرح کا مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: ہندوستان اور پاکستان کے بیچ دشمنی کے طویل سلسلے کو جس طرح اہل قلم دوستی میں تبدیل کر سکتے ہیں، اس طرح دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کر کے اور لکھے ہوئے لفظ کے ذریعے۔ کتب کا تبادلہ اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ نیز ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ممالک اہل قلم کو ویزا دینے میں سہولتیں پیدا کریں۔ اس سے دونوں ملکوں کے ادیب اور شاعر وہ کام کر گزریں گے جو ہمارے سیاست دانوں سے ممکن نہ ہو سکا۔

سوال: اپنے تخلیقی سفر کی بابت آپ کے احساسات کیا ہیں؟ نیز مستقبل کی آرزوئیں اور ارادے؟

جواب: فراق گورکھپوری کا ایک شعر ہے:

تجھ سے اے دریائے محبت، پار کوئی بھی پا نہ سکا
کیسے کیسے ڈوب گئے، گو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے

میں نے ایک ناول شروع کر رکھا ہے، اگر مکمل کر پایا۔ افسانوں کا پانچواں مجموعہ اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ تنقیدی مضامین کے دو مجموعے اسی سال شائع ہو جائیں گے۔ عہد عالمگیری کے ایک تصوف سے متعلق فارسی تذکرہ ''ظواہر السرائر'' پر کام کر رہا ہوں۔

□□□

رابطہ:
225-Nashtar Block
Allama Iqbal Town, Lahore
(Pakistan)

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

نومبر2006 سے ہم نے "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کیا ہے جس میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔

(ادارہ)

سوال: آج کل بعض کتب و رسائل میں 'منہ' لکھا جا رہا ہے اور بعض میں 'منھ'، صحیح املا کیا ہے؟

جواب: اس لفظ کو کئی طرح لکھا جاتا رہا ہے، منھ، منہ، موں، مونہہ، مونھ، وغیرہ۔ دلی والے کچھ عرصہ پہلے تک عام طور پر "مونہہ" یا "مونھ" لکھتے تھے۔ قاعدے کے اعتبار سے "منہ" کو صحیح ترین املا کہنا چاہیے۔ لیکن رواج عام کا رجحان "منھ" کی طرف ہے۔ "منہ" بھی بہت دنوں سے رائج ہے لیکن میں "منھ" کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ میرے مشاہدے کے مطابق "منھ" لکھنے والے اکثریت میں ہیں۔ لیکن میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ آپ جو املا اختیار کر لیں اسی پر قائم رہیں۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" جیسے عظیم لغت میں "منہ" اور "منھ" کو بے دریغ خلط ملط کیا گیا ہے۔ یہ عمل گمراہ کن ہے۔

سوال: 'معائنہ' لکھنا درست ہے یا معاینہ؟

جواب: عربی قاعدے سے "عین" کو باب مفاعلہ میں لے جاتے ہیں اور "معاینہ" بفتح تحتانی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اردو میں لوگ بیش از بیش "معائنہ" مع ہمزہ اور مع کسرۂ ہمزہ لکھتے ہیں اور یہی درست ہے۔ "معاینہ" پہلے بھی بہت کم رائج تھا، اب کئی دہائیوں سے بالکل رائج نہیں ہے۔ اردو کے عمل کے لحاظ سے "معاینہ" اب غلط ہے۔

سوال: 'آئینہ' لکھنا درست ہے یا 'آئنہ'؟

جواب: "آئنہ" لکھنے کا کوئی جواز نہیں، نہ فارسی میں نہ اردو میں۔ عام حالات میں "آئنہ" بالکل غلط ہے۔ شعر میں کہیں کہیں "آئینہ" بروزن فاعلن آتا ہے، مثلاً:

کیا صفائے پیکر دلدار کی تاثیر ہے
گر وہ ٹک بیٹھے وہیں بن جائے دیوار آئینہ

(ناسخ)

یہ چشم آئینہ دار رو تھی کسو کی
نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی

(میر)

بعض لوگ ایسے حالات میں "آئینہ" کی جگہ "آئنہ" لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن اس کی نہ ضرورت ہے نہ جواز۔ ضرورت اس لیے نہیں کہ اگر تلفظ اور وزن کا لحاظ کر کے املا کو بدلیں تو یہ عمل لامتناہی ہو جائے گا۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار میں "اور" کو "ار" بروزن فع باندھا گیا ہے:

شغلِ خود بینی تھا شانِ بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی

(نظم طباطبائی)

بیعت پذیر سلسلۂ پیچ و تاب ہیں
شانے سے مو و مو سے بلا اور بلا سے ہم

(نظام الدین ممنون)

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

(غالب)

لہٰذا جس منطق کی رو سے ہم "آئینہ" کو "آئنہ" لکھنے کی سفارش کرتے ہیں، اسی منطق کی رو سے ہمیں مندرجہ بالا اشعار میں "اور" کی جگہ "ار" لکھنے کی سفارش کرنی چاہیے۔ لیکن ایسا کوئی نہیں کرتا، اور نہ کرنا چاہیے۔

یہ تو ہوئی ضرورت نہ ہونے کی بات، "آئینہ" کو "آئنہ" کرنے کا جواز اس لیے نہیں ہے کہ رسم الخط اور املا کی اپنی تقدیس ہے اور ان کو

مجروح کرنا یا ان میں تغیر کرنا اسی طرح غلط ہے جس طرح صرف ونحو میں تغیر کرنا، خواہ وہ کسی بھی وجہ سے ہو۔

(سوالات از فیروز عالم، شعبۂ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد)

سوال: 'دیگر' اور 'اور' کا محل استعمال کیا ہے؟ مثلاً 'وہاں دیگر حضرات بھی موجود تھے۔' 'وہاں اور حضرات بھی موجود تھے۔'

جواب: یہ دونوں استعمالات خلاف محاورہ ہیں۔ صحیح یوں ہے:

وہاں کچھ دیگر حضرات بھی موجود تھے، وہاں کچھ اور حضرات بھی موجود تھے۔

''دیگر'' کی جگہ ''اور'' کا استعمال یہاں بہتر ہے، لیکن ''کچھ'' کے بغیر دونوں ہی استعمالات صحیح نہیں۔

سوال: 'سانس' مذکر ہے یا مونث؟

جواب: اس لفظ کو مونث اور مذکر دونوں طرح سنا گیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ دہلی والے اسے مذکر بولتے ہیں اور لکھنو والے مونث۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ زبانوں پر دونوں طرح رواں ہے:

آہ جاتی تھی آسماں پہ کبھی
سانس بھی اب تو لی نہیں جاتی

(جلال)

ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی
دل میں ہے آگ مرے اور لگاتی جاتی

(بہادر شاہ ظفر)

بادشاہ میں کچھ سانس باقی تھے۔

(فقرہ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی)

دم چڑھ گیا ہے، سانس اکھڑتی ہے دم بدم
صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اٹھیں قدم

(میر انیس)

صاحب ''آصفیہ'' نے دلچسپ بات لکھی ہے کہ اگرچہ شعرا نے اس لفظ کو مونث باندھا ہے لیکن یہ زبانوں پر مذکر ہے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اگر تمام زبانوں پر مذکر ہوتا تو پھر شعرا اسے مونث کیوں باندھتے؟ اصل صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ ''سانس'' کو مذکر بولتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ مونث بولتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو مجرد ''سانس'' کو مونث کہیں گے، لیکن ''سانس اکھڑ گیا، سانس پھول گیا'' وغیرہ بھی بول دیں گے۔ بہر حال، چونکہ بولنے والوں کی اکثریت ''سانس'' کی تانیث کے حق میں ہے لہٰذا اسے مونث کہنا بہتر ہوگا۔

سوال: 'کلیات' کو مذکر استعمال کرنا چاہیے یا مونث؟

جواب: کسی شخص کے تمام کلام (خواہ نظم خواہ نثر) کے مجموعے کے معنی میں یہ لفظ عام طور پر مذکر بولا جاتا ہے لیکن پلیٹس (Platts) اور ''آصفیہ'' نے اسے مونث لکھا ہے۔ ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں اسے مذکر اور مونث دونوں لکھا ہے لیکن مونث کی کوئی سند نہیں دی ہے۔ ''نور اللغات'' میں اسے مذکر لکھا گیا ہے اور یہی مرجح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض لوگ اسے مونث بھی لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا فی الحال اسے مختلف فیہ کہنا چاہیے۔ بہادر شاہ ظفر:

دیواں ظفر کا دیکھ کے کاتب ہیں کہہ رہے
لکھیں کہاں تلک ترے ہم کلیات کو

لیکن کہا جاسکتا ہے، ممکن ہے ظفر نے ''کی کلیات'' لکھا ہو، اس زمانے میں ''کے/کی'' میں فرق لکھنے کی حد تک نہ تھا۔ میری ترجیح بہر حال مذکر کو ہے۔

(سوالات از عبدالمتین، بڑتلہ، پاکوڑ، جھارکھنڈ۔816105)

سوال: 'کے بجائے' اور 'کی بجائے' کا محل استعمال کیا ہے؟

جواب: میں ہمیشہ ''کے بجائے'' لکھتا ہوں اور میں نے زیادہ تر یہی لکھا دیکھا بھی ہے۔ مستند لوگوں میں صرف محمد حسن عسکری التزاماً ''کی بجائے'' لکھتے تھے۔ اس باعث میں ''کی بجائے'' کو غلط نہیں کہہ سکتا لیکن خود ہمیشہ ''کے بجائے'' لکھنے اور بولنے کو مرجح سمجھوں گا۔

سوال: کیا شہروں یا جگہوں کے نام میں امالہ لگانا درست ہے؟

جواب: امالہ ایک مستقل اور ناقابل تبدیل عمل ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے قاعدے پوری طرح مقرر نہیں ہوسکے ہیں۔ بہر حال، بنیادی اصول یہ ہے کہ جن لفظوں میں امالہ درکار ہے، ان کو بولتے وقت امالہ ضرور کرنا چاہیے، خواہ ان کو ممال (یعنی امالے کی شکل میں) نہ لکھا گیا ہو۔ جہاں تک آپ کے سوال کا معاملہ ہے، تو جواب اس کا یہ ہے کہ شہروں اور جگہوں (ملکوں نہیں) کے ناموں پر امالہ جاری ہوتا ہے، خواہ لکھا نہ جائے۔ اکثر صورتوں میں ممال لکھنا کچھ بدنما بھی لگتا ہے، لہٰذا ممال کر کے لکھتے نہیں ہیں، لیکن پڑھتے اور بولتے امالے کے ساتھ ہیں۔ مثال کے طور پر: پٹنہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

یہاں ''پٹنہ'' کا تلفظ ''پٹنے'' ہوگا۔

وہ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔

یہاں ''آگرہ'' کو ''آگرے'' بولیں گے۔

یہ سڑک سیدھی شملہ کو چلی گئی ہے۔
یہاں "شملہ" کو "شملے" بولیں گے۔

سوال: اردو میں Duel کیسے لکھنا چاہیے۔ ڈویل یا ڈوئل؟

جواب: Duel اور Dual جیسے انگریزی الفاظ میں a اور e کی حرکت ہمزہ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان لفظوں کا صحیح اردو املا "ڈوئل" ہے اور یہی شروع سے چلا آرہا ہے۔ ناگری میں چونکہ ہمزہ نہیں ہے اس لیے وہ لوگ ہمزہ کی آواز یا ڈ کر تحتانی لکھتے ہیں اور بعض اردو والے، خاص کر اسکولی بچے اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مثلاً:
اردو میں کوئل، لیکن ہندی میں کویل؛ اردو میں فائدہ، لیکن ہندی میں فایدہ؛ اردو میں پوئم (poem)، لیکن ہندی میں پویم؛ اردو میں ڈوئل، لیکن ہندی میں ڈویل۔

ہندی املا اور تلفظ ہندی کے لیے ٹھیک ہے اردو والوں کو اپنے املا اور تلفظ کی پابندی کرنی چاہیے۔

(سوالات از نگار خانم، کاشانۂ شفیق، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھوپور، راجستھان)

□□□

رابطہ:
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India
West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Ph.: 26109746, 26169416 Fax:26108159, E-mail: urducouncil@rediffmail.com

ممبئی قومی کتاب میلہ

تاریخ : 18 تا 28 جنوری 2007
وقت : 11 بجے دن سے شام 8 بجے تک
مقام : کراس میدان، چرچ گیٹ، ممبئی۔ 020 400

قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے،
جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس و ٹیکنالوجی، بچوں کا ادب اور طب و معالجات وغیرہ۔

رؤف پاریکھ

رومن اردو کیوں؟

اطلاعاتی ٹکنالوجی نے دنیا کو ایک طوفان کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان بھی طوفان بن کر دنیا پر چھا گئی ہے۔ بلکہ انگریزی زبان صحیح معنوں میں دنیا (بقول شخصے عالمی گاؤں یا گلوبل ولیج بن چکی ہے) کی مشترکہ زبان یا لنگوا فرینکا (lingua franca) ہے۔ انگریزی سیکھنا ہر شخص کے لیے خواہی نخواہی ضروری ہو گیا ہے بالخصوص ایک مختلف ثقافت یا مختلف زبان کے حامل خطے کے لوگوں سے ابلاغ و ارتباط کے لیے انگریزی ناگزیر بن چکی ہے۔ چونکہ آج کی دنیا میں تمام جدید علوم وفنون کے خزانے انگریزی زبان میں موجود ہیں اور کسی بھی موضوع پر ہونے والی جدید تحقیق اور اس کے مصادر و منابع اس زبان میں دست یاب ہیں اور انٹرنیٹ نے ان تک رسائی اور ان کا حصول بھی نہایت آسان اور کم خرچ بنا دیا ہے لہٰذا آج کی دنیا میں انگریزی سے ناواقفیت گویا بیک وقت اندھا، گونگا اور بہرا ہونے کے مترادف ہے۔ انگریزی کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔

لیکن انگریزی زبان کی ان فتوحات کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کے ذہن میں چند سوالات ضرور ابھرتے ہیں جنھیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب و ثقافت سے واقعی محبت ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا کسی قوم نے اپنی زبان یا اپنے رسم الخط کو انگریزی زبان یا رومن رسم الخط کی خاطر اترن کی طرح اتار پھینکا ہے؟ کیا کسی قوم نے کمپیوٹر (بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انٹرنیٹ) کے استعمال میں سہولت کی خاطر اپنے رسم الخط کو ترک کر کے ثقافتی خودکشی کی ہے؟ جب بھی میں کہیں یہ بحث سنتا یا پڑھتا ہوں کہ اردو کو رومن حروف میں لکھا جانا چاہیے، یہ سوالات میرے ذہن میں سر ابھارنے لگتے ہیں۔

جو لوگ اردو کے رسم الخط میں تبدیلی کی وکالت کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر اردو کو رومن رسم الخط کے پلے باندھ دیا جائے تو اردو اور اس کے نئے رسم الخط دونوں کی زندگی ...... اور ہماری بھی...... چین اور آرام سے گزر جائے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ٹکنالوجی کے اس دور میں کوئی زبان اس وقت اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے نو ساختہ مذہب پر ایمان نہ لے آئے۔ یہ اور اسی قسم کی دیگر بظاہر معقول مگر درحقیقت بے سروپا باتیں اس ضمن میں کی جاتی ہیں۔ اردو کے یہ خود ساختہ دوست ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جیسے ہی اردو رومن حروف تہجی کو اختیار کرے گی کسی جادو کے زور پر وہ جدت اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں داخل ہو جائے گی، یہ انٹرنیٹ پر چھا جائے گی اور ساری دنیا میں اس کا چلن عام ہو جائے گا اور نجانے کیا کیا ہو جائے گا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بے اصولے اور من کے کھوٹے لوگ کسی کے اشارے پر اور سرپرستی میں ایک ایسی باقاعدہ مہم چلا رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ قوم کی کچھ ایسی ذہنی تطہیر کی جائے کہ یہ اردو اس کی زندگی بھر کے شریک حیات...... یعنی اس کے عربی رسم الخط سے علیحدگی پر آمادہ ہو جائے۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل چلائی جانے والی بدنیتی پر مبنی اس مہم کے اس نئے جنم پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس مہم کی تجہیز و تکفین کو بھی کوئی نصف صدی گزر چکی ہے اور لوگ اسے بھول بھال گئے ہیں۔ ایسے موقعے پر یہ شبہات پیدا ہونا فطری امر ہے کہ اب یہ مہم کیوں اور کس کے اشارے پر چلائی جا رہی ہے۔

جدید دور میں، سوائے ترکی کے، ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی قوم اتنی نامعقول ہو کہ اس نے اپنے رسم الخط کو ترک کر کے اپنے ماضی، اپنی ثقافت اور اپنے ادب سے تمام رشتے یک بیک منقطع کر لیے ہوں...... وہی رسم الخط جس میں وہ قوم صدیوں سے لکھتی اور اپنے ہم زبانوں سے اپنے دل کی بات کہتی چلی آ رہی ہو۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے 1928 میں ترکی کا رسم الخط عربی سے رومن کر دیا تھا (1) اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے عربوں اور عربی سے نفرت تھی اور اسے یہ باور کرایا گیا تھا کہ اپنے رسم الخط کو یعنی اپنی تاریخ، ثقافت اور مذہب کو بھلا دینے سے ترکی فوراً ہی ترقی اور یورپ کے ساتھ بھائی چارے کے دور میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن واحسرتا کہ یورپ کے ساتھ برابری رسم الخط کی تبدیلی کے پچھتر (75) سال بعد بھی ترکی سے گریزاں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ترکی کو ہنوز یورپی یونین کا مکمل رکن نہیں بنایا گیا خواہ ترکی یورپیوں سے زیادہ یورپی بننے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کرتا رہے (برسبیل تذکرہ، یورپ کے سابقہ اشتراکی ملکوں کو ترکی پر ترجیح دیتے ہوئے رکن بنا لیا گیا ہے اگرچہ ترکی نے ان سے بہت پہلے درخواست دے رکھی ہے)۔ دراصل بات یہ ہے کہ خود کو دوسروں کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اپنی شناخت اور اپنی اصلیت کو چھوڑنا ایسی ہی حماقت آمیز بات ہے جیسے کوئی اپنی کھال بدلوا کر نیا اور بہتر

انسان بننے کا دعویٰ کرے۔

جہاں تک سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال اور اس میں مہارت اور ترقی کی بات ہے تو چند ہی قومیں ہوں گی جو اس میدان میں جاپانیوں کی ہم پلہ ہوں۔ جاپان نے ٹکنالوجی کے استعمال کے علاوہ اس کی ایجاد میں بھی تقریباً ہر قوم کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تو کیا انھوں نے اپنے رسم الخط کو ترک کر دیا ہے؟ معروف ماہر لسانیات ماریو پی (Mario Pie) اپنی معروف کتاب The Story of Language میں لکھتے ہیں کہ انیس سو پچاس (1950) کے لگ بھگ چند امریکی ماہرین تعلیم نے جاپانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے رسم الخط سے ''چھٹکارا'' پالیں اور اس کی بجائے رومن حروف اختیار کر لیں (2)۔ جاپانیوں نے ان کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا اور دلیل دی کہ اس طرح تو اس وقت تک موجود تمام کتابیں ردی ہو جائیں گی اور ان سب کو پھینک کر انھیں نئے سرے سے یعنی نئے رسم الخط میں چھاپنا پڑے گا (3)۔ اور یاد رہے کہ جاپانی رسم الخط اس لحاظ سے مشکل ترین خیال کیا جاتا ہے کہ چینی زبان کی طرح یہ بھی تصویری خط (ideogram) ہے اور یہ غیر صوتی ہے، اس میں حروف تہجی نہیں ہوتے بلکہ یہ تلفظ کو ظاہر کرنے والے نشانات یا علامات یعنی syllabic characters پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جاپانیوں کے پاس رسم الخط کو ترک کرنے کے لیے اس کے بہت مشکل اور پیچیدہ ہونے کا بہانہ بھی موجود تھا لیکن وہ اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اب ذرا ان دیگر ''ترقی یافتہ'' اقوام کے رسم الخط پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جو ٹکنالوجی اور سائنس میں بہت آگے ہیں اور ان کا رسم الخط رومن نہیں ہے یعنی روس، چین، کوریا اور اس میں ملائشیا کو بھی شامل کر لیجیے۔ کیا وہ بھی رسم الخط میں تبدیلی کے کسی منصوبے پر غور کر رہے ہیں یا رومن حروف کو اپنائے بغیر ہی سائنس اور ٹکنالوجی میں آگے بڑھ جانے اور ترقی کر لینے کے اہل ثابت ہوئے ہیں۔ کسی زبان کا رسم الخط تشکیل پانے میں صدیاں لگتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اور یہ ان تمام پیچیدگیوں، نزاکتوں، لسانیاتی مجبوریوں، صوتیاتی ضرورتوں اور کتابت کی الجھنوں کے حل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے جو اس زبان میں درپیش ہوتی ہیں۔ فطری طریقے سے تشکیل اور قدرتی طور پر ارتقا پایا ہوا رسم الخط ہی کسی زبان کی خوب صورتی اور اس کی قوت نمو کو صحیح طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی زبان میں پائی جانے والی تمام آوازیں اور الفاظ کے درست تلفظ کو اس زبان کے اپنے رسم الخط ہی میں درست طور پر ظاہر اور ادا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کسی زبان کا اپنا رسم الخط ہی اس کے لیے موزوں ترین ہوتا ہے۔ کسی اجنبی اور بیگانے رسم الخط میں لکھی گئی زبان ایک ایسے مقید پرندے کی مانند ہوتی ہے جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں، جس کی روح کو کچل دیا گیا ہو اور اسے ایک بے شناخت غلام بنا دیا گیا ہو۔

اردو کا رسم الخط بنیادی طور پر اس سامی رسم الخط کی ترمیم شدہ شکل ہے جو عربی لکھنے میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط پہلے ایران پہنچا اور وہاں سے بر عظیم پاک و ہند۔ فارسی زبان میں بعض ایسی آوازیں ہیں جن کو ظاہر کرنے کے لیے عربی میں حروف نہیں تھے، مثلاً ''چ''، ''گ'' اور ''پ''۔ فارسی کی صوتیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل ایران نے عربی حروف میں ترمیم و اضافے کے ذریعے، مثلاً ''ب'' اور ''ج'' کے نقطوں کی تعداد میں اضافہ کر کے یا کاف کی کشش کو دوہرا کر کے، عربی رسم الخط کو اپنی ضروریات کے مطابق بنا لیا۔ جب مسلمان اس رسم الخط کو ہندوستان لے کر آئے تو اس طرح کی ترمیم و اضافے سے اسی رسم الخط میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کی ان آوازوں کو لکھا جانے لگا جو عربی اور فارسی میں وجود نہیں رکھتی تھیں، مثلاً ''ٹ''، ''ڈ'' اور ''ڑ''۔

دنیا کی کئی دیگر زبانوں کی طرح اردو کا اپنا رسم الخط ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے ان ساری آوازوں کو بتمام و کمال لکھا اور ادا کیا جا سکتا ہے جو اردو میں وجود رکھتی ہیں۔

کسی بھی زبان کے رسم الخط میں تبدیلی کرنا کوئی معمولی بات نہیں اور یہ مشکل کام اس صورت میں مشکل تر ہو جاتا ہے جب نئے یعنی مانگے کے رسم الخط میں وہ ساری آوازیں نہیں ہوتیں جو اس مخصوص زبان میں وجود رکھتی ہیں جس کا رسم الخط بدلنا مقصود ہے۔ اردو میں ایسی کئی آوازیں موجود ہیں جو رومن رسم الخط میں لکھی جانے والی۔ اکثر زبانوں میں وجود نہیں رکھتیں، مثلاً ''ق'' یا ''غ'' ''یا'' ''ڑ'' یا ''چھ''۔ اور جہاں تک آوازوں کا معاملہ ہے تو اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ حروف تہجی کی تعداد کے لحاظ سے وہ ایک اتنی ثروت مند زبان ہے کہ تقریباً ہر آواز کو ادا کر سکتی ہے، چاہے وہ عربی کا ''ق'' ہو یا ''غ''، فارسی کا ''ژ'' ہو یا سنسکرت و دراوڑی کا ''ڑ'' اور ''گھ'' اردو میں ان آوازوں کو اسی طرح بولا اور اردو کے اپنے رسم الخط کے ذریعے بالکل ٹھیک ٹھیک لکھ کر بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اردو کا اپنا رسم الخط رومن رسم الخط کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہے۔ رومن رسم الخط تو اردو کی نصف آوازیں بھی ٹھیک طور پر ادا نہیں کر سکتا۔

رومن رسم الخط میں اردو لکھنے سے صرف آوازوں کی درست ادائی ہی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ایک اور پریشانی بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ رومن رسم الخط میں اردو لکھتے ہوئے اضافی حروف علت یا مصوتہ یعنی واول (vowel) استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ عربی یعنی اردو رسم الخط میں مصوتوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور خفیف مصوتوں کے لیے کوئی الگ حرف

نہیں ہوتا بلکہ ان کی قدر (value) (یعنی صوت کا دورانیہ یا کیفیت) حروف کے اوپر یا نیچے اعراب لگا کر ظاہر کی جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ جس حرف کی جس حرکت کو ہم اردو میں زیر، زبر یا پیش سے ظاہر کر دیتے ہیں اس کے لیے رومن میں حرف علت یا مصوتہ (vowel) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم لفظ ''مستقبل'' رومن حروف میں لکھنے کی کوشش کریں (mustaqbil) تو اس میں تین حروف علت ''یو''، ''اے'' اور ''آئی'' لکھنے ہوں گے جب کہ ان کے اردو تلفظ میں کسی مصوتے کی کوئی آواز شامل نہیں اور اسی طرح بعض لفظوں میں اردو میں جہاں ایک حرف علت ہے اسے رومن میں لکھتے ہوئے بسا اوقات دو حروف علت لانے پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے میں حرف علت دہرے مصوتے (diphthong) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا رومن رسم الخط اردو کے انفرادی اوصاف اور رنگ ڈھنگ ہی کو بدل دے گا۔

انگریزی جو رسم الخط استعمال کرتی ہے اس کے بارے میں بھی لب کشائی کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ جب انگریزی نے لاطینی حروف اپنائے تو اس بات کا ابتدا ہی میں احساس ہو گیا کہ یہ حروف نہ صرف یہ کہ انگریزی لکھنے کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ ان میں انگریزی کی تمام آوازوں کو آسانی سے اور ایک حرف کو ایک علامت سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان میں سے کچھ حروف اضافی ہیں اور یہ جن آوازوں کو لاطینی میں ظاہر کرتے ہیں ان کا انگریزی میں وجود ہی نہیں ہے۔ رومن رسم الخط رومنوں کی لسانی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ایجاد کیا گیا تھا اور اسے بعد میں دیگر اقوام نے اختیار کر لیا(4)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی الفاظ کے ہجے ان کے تلفظ سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ کئی ماہرین لسانیات نے انگریزی میں املا کے قوانین کو اُلل ٹپ اور من مانا (arbitrary) قرار دیا ہے۔

انگریزی کے معروف ڈراما نگار جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) (1950-1956) نے تو انگریزی کے ہجے کے قوانین کا مذاق اڑاتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ انگریزی میں لفظ ''گھوٹی'' (ghoti) کو ''فش'' (fish) پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی کہ انگریزی میں بعض اوقات جی ایچ (gh) کو ایف (f) بھی پڑھا جاتا ہے مثلاً لفظ لاف (laugh) میں۔ اسی طرح او (o) کا تلفظ کبھی آئی (i) کی طرح بھی کیا جاتا ہے جیسے ویمن (women) میں۔ اور ٹی آئی (ti) کبھی ش (sh) کی آواز بھی دیتا ہے مثلاً نیشن (nation) میں۔ اس طرح انگریزی میں ghoti لکھ کر fish پڑھنا عین ممکن ہے۔ برنارڈ شا نے انگریزی کے ہجے کے قوانین بدل کر انھیں عقل و منطق کے مطابق بنانے والے کے لیے ایک بڑی رقم کے نقد انعام کا بھی اعلان کیا(5) (افسوس کہ یہ انعام آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا، شاید اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں)۔

املا اور ہجے کے اصولوں میں تبدیلی کرنا کوئی مذاق نہیں ہے اور انگریزی جیسی زبان کے لیے تو یہ تقریباً ناممکن ہے جس میں چوالیس (44) صوتی اکائیاں یا صوتیے یعنی فونیم (phoneme) ہیں (6) اور ان کو ظاہر کرنے کے لیے صرف چھبیس (26) حروف تہجی ہیں لہٰذا ان چوالیس آوازوں کو ''ایک آواز ایک علامت'' کی بنیاد پر لکھ کر ظاہر کرنا ممکن نہیں۔ گویا رومن رسم الخط میں صرف یہی خرابی نہیں کہ اس میں بہت سی آوازوں کو لکھ کر ظاہر ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں یہ بھی نقص ہے کہ اس میں ایک آواز کو ایک حرف سے ظاہر کرنا بھی ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ''ش'' کی یا ''چ'' کی آواز کو اردو اور کئی دوسری زبانوں میں ایک حرف تہجی سے ظاہر کیا جاتا ہے لیکن رومن رسم الخط میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے دو دو حروف یعنی ایس ایچ (sh) اور سی ایچ (ch) لکھنے پڑتے ہیں۔

جو لوگ اردو کے لیے رومن رسم الخط کی وکالت کرتے ہیں وہ رسم الخط کی اہمیت کو شاید پوری طرح نہیں سمجھتے۔ وہ غالباً زبان اور رسم الخط کو دو الگ الگ وجود خیال کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں رسم الخط ہی زبان ہے۔ کیونکہ حروف تہجی تو وہ علامات ہیں جو زبان میں استعمال ہونے والی بنیادی آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں اور کسی زبان کا اپنا فطری رسم الخط ہی اس میں موجود تمام دقائق و لطائف، تلفظ میں معمولی تبدیلیوں اور کسی لفظ کے کسی خاص جزو پر زور یا تاکید کو صحیح طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ اس دعوے کی تصدیق کے لیے انگریزی کو اردو رسم الخط میں لکھ کر دیکھیے، اگرچہ اردو میں موجود متنوع آوازیں اور اس کے اعراب کا نظام انگریزی آوازوں اور تلفظ کی درست ادائی میں معاون ہوگا لیکن نتائج اطمینان بخش نہیں ہوں گے۔

اردو کا رسم الخط رومن کرنے کا ایک نقصان یہ ہوگا کہ مشرق وسطی سے ہمارے لسانی اور ثقافتی روابط اچانک منقطع ہو جائیں گے۔ ایک مشترک رسم الخط نے انھیں ایک رشتے میں باندھ رکھا ہے۔ ایک رسم الخط کی وجہ سے اس شخص کے لیے عربی اور فارسی سیکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے جو اردو سے واقف ہے۔ ایران اور عرب ممالک میں سفر کے دوران ہوائی اڈے یا سڑک یا کسی بھی جگہ پر چھوٹے موٹے بورڈ یا ہدایات کو پڑھنا آسان ہوتا ہے اور اسی طرح ان ملکوں کے باشندے پاکستان میں اتنی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ اگر یہ چیزیں اردو میں لکھی ہوں۔ اور پھر ذرا ہماری آنے والی نسلوں کا تو سوچیے! موجودہ رسم الخط سے محروم ہو کر وہ اردو (اور عربی، فارسی) کے ان شاہکاروں کو پڑھنے اور سمجھنے سے محروم ہو جائیں گی جو صدیوں سے ہمارا قابل فخر سرمایہ چلے آ رہے ہیں۔ ہر شاہکار کو پہلے نئے رسم الخط میں لکھ کر شائع کرنا پڑے گا تاکہ

وہ ان خزانوں سے محظوظ ہو سکیں۔ اور یہ محرومی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا نقصان جو ایک مسلمان کے تصور میں آ سکتا ہے وہ قرآن پاک کی تلاوت سے محروم ہو جانا ہے اور یہ محرومی ایسی ہے کہ اس کے آگے تمام نقصانات ہیچ ہیں۔

اردو کے رسم الخط کو بدلنے اور رومن حروف کو اپنانے کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے اردو کمپیوٹر کی دنیا میں داخل ہو جائے گی۔ یہ دلیل دینے والوں کے علم میں یہ بات غالباً نہیں ہے کہ اب اردو کے مختلف سوفٹ ویر آسانی سے دست یاب ہیں اور کمپیوٹر سے دل چسپی رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد انھیں استعمال بھی کر رہی ہے۔ اردو میں برقی مکتوب (ای میل) اب کوئی نئی چیز نہیں رہی۔ دیگر اداروں کے ساتھ ساتھ مقتدرہ قومی زبان نے بھی اردو کو "سائبر" بنانے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی ایک بڑی حالیہ کام یابی مائیکروسوفٹ کے اشتراک سے "مقتدرہ اردو آفس 2003" کا اجرا ہے (7)۔ اردو کو اس وقت ایک نئی اور سائنسی جہت ملی جب مائیکروسوفٹ کے کمپیوٹر پروگرام "ونڈوز ایکس پی" کو اردو میں بھی متعارف کرایا گیا اور اس طرح اردو ای میل (e-mail) یعنی اردو برقی مکتوب بہت آسان ہو گیا (8)۔ اردو ویب سائٹوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور انٹر نیٹ پر اردو کے لکھے ہوئے صفحات اپنا وجود رکھتے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اردو میں "چیٹنگ" یعنی کمپیوٹر کے ذریعے بات چیت کو متعارف ہوئے اب تین چار سال ہونے کو آ رہے ہیں اور یہ کوئی عجوبہ یا نئی چیز نہیں رہی۔ غرض اردو اس سائنسی دور میں کمپیوٹر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے لہٰذا اردو کے رسم الخط کو رومن کرنے کا مطالبہ کرنے والے کم از کم کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کے استعمال کو جواز نہ بنائیں اور اس کے لیے کوئی اور معقول بہانہ تراشیں (بہانے تو انھیں بہت مل جائیں گے مگر معقول ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا)۔ اردو کے رسم الخط میں تبدیلی (9) کا مطالبہ کرنے والے اردو کے دوست ہرگز نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو بقول غالب:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

حواشی

1. پی، ماریو، (Pei, Mario) "The story of language" نیو امریکن لائبریری، نیو یارک، 1966، ص 101
2. ایضاً، ص 102
3. ایضاً، ص 102
4. ایضاً، ص 101؛ بحوالہ کرسٹل، ڈیوڈ Crystal, (David) "the Penguin dictionary of language"، (دوسرا ایڈیشن) 1999 ص 12، 291۔
5. پی، ماریو، "The story of Pei, language Mario"، ص 101، 102
6. سائمن پوٹر Simeon Potter نے اپنی کتاب Our language میں لکھا ہے کہ انگریزی میں چوالیس (44) آوازیں ہیں جن میں سے بارہ (12) حروف علت یا مصوتے (Vowels)، نو (9) دہرے مصوتے (dipthong) اور 23 مصمتے یا حروف صحیح (consonants) ہیں۔ (پینگوئن بکس، 1973، ص 62) البتہ بعض ماہرین کے خیال میں انگریزی میں پینتالیس (45) صوتیے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انگریزی میں مصوتوں کی تعداد تیرہ (13) ہے، مثلاً Edward Finegan اپنی کتاب Lanugage: its structure and use میں لکھتے ہیں کہ فرانسیسی میں پندرہ (15) اور انگریزی میں تیرہ (13) مصوتے ہیں۔ (ہارکورٹ بریس کالج پبلشرز، فورٹ ورث، 1999، ص 234)۔ جب کہ اس کے مقابلے میں اردو میں ایک رائے کے مطابق اٹھاون (58) صوتیے یا فونیم ہیں (ملاحظہ ہو: "اردو ساخت کے بنیادی عناصر" از نصیر احمد خاں، اردو محل پبلی کیشنز، نئی دہلی، 91-1990)
7. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو محمد اکبر سجاد کا مضمون مشمولہ "اخبار اردو"، فروری 2006، ص 31-19۔
8. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو محمد نعمان کا مضمون مشمولہ "اخبار اردو"، فروری 2006، ص 33-32
9. اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوگا: "اردو زبان اور اس کا رسم الخط" از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مطبوعہ کتاب نگر، لکھنؤ، (دوسرا ایڈیشن) 1961۔

"رومن رسم الخط اور پاکستان: ایک علمی جائزہ"، از سید عبدالقدوس ہاشمی، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، (دوسرا ایڈیشن) 1965 "اردو رسم الخط اور اس کی اہمیت"، از محمد امین عباسی، مطبوعہ ایشیاٹک لٹریری سوسائٹی، لکھنؤ 1959، "اردو رسم الخط اور ٹائپ"، از ڈاکٹر طارق عزیز، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1987

"اردو رسم الخط"، مرتبہ شیما مجید، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989۔

(بہ شکریہ اخبار اردو، اسلام آباد، نومبر 2006)

□□□

تحریر: راہی معصوم رضا
ترجمہ: خورشید عالم

سنیما، ادب اور نصاب

آج کی بحث کا موضوع ہے کہ کیا سنیما کو ادب کے نصاب کا حصہ بنانا مناسب اور ضروری ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب کی تلاش کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے اور تمہید کا تعلق ادب کی تعریف سے ہے۔ کیا ادب پیغمبری کا درجہ رکھتا ہے؟ کیا ادب، ادیب کی ذاتی ملکیت ہے؟ اور کیا قاری ایسا بندھوا مزدور ہے جو اس کی تخلیق کو پڑھتا ہے؟ آج ان سوالوں کا جواب دینا بہت ضروری ہے۔ حالانکہ قاری کے بارے میں اٹھائے گئے سوالوں پر آج تک غور ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے اپنی بات کے آغاز میں ہی قاری کی اہمیت کو قبول کر لینا چاہتا ہوں تاکہ بحث میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

میرے خیال میں ادب، ادیب اور قاری...... تخلیقی فن کی مثلیث ہے۔ قاری کی غیر موجودگی میں ادب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ادب قاری کے پاس پہنچ کر ہی ادب بنتا ہے۔ کسی شاعری کے معنی وہ نہیں ہیں جو شاعر کے ذہن میں ہے۔ شاعری کو تو قاری معنی دیتا ہے۔ غالب سے پوچھا گیا کہ صاحب آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ "بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے"، وہ بوجھ جو پھر اٹھایا نہیں جا سکتا، اسے آپ نے سر پر رکھا کیسے تھا تو غالب تیلن اور اس کے سر پر رکھے ہوئے تیل کے گھڑے کی بات کرنے لگے کہ وہ تیل گر گیا تو تیلن اس بوجھ کو کیسے اٹھائے اور پھر انھوں نے اس کا تعلق عارف کی موت سے جوڑ دیا۔ مگر مجھے یا آپ کو عارف کی موت سے کیا لینا دینا؟ اور بیسویں صدی کے آخر میں ہمیں یہ شعر کیوں پسند آتا ہے؟ اس شعر کو صحیح یا غلط پڑھنے والوں یا گانے والوں میں سے کتنوں کو عارف اور اس کی موت کا پتہ ہے؟ عرض مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ہمیں پسند ہے تو اس کا مطلب وہی جو ہم نے سمجھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی پھیلاؤ آتا رہتا ہے اور معنی میں پھیلاؤ کا یہ تخلیقی عمل شاعر کا نہیں بلکہ قاری کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اپنے حوالوں میں گذشتہ ادب کو پڑھ کر اسے رد یا قبول کرتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں شعر کا کوئی معنی ہی نہیں ہوتا اور قاری اسے وسیع معنی عطا کرتا ہے۔ میں اپنے استاد محترم معین احسن جذبی کی مثال دے سکتا ہوں۔ میرے طالب علمی کے زمانے میں کچھ انھوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جب محفلوں اور مشاعروں میں ان کے اس شعر کی تعریف ہونے لگی:

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر، ساحل کی تمنا کون کرے

تو وہ یہ سمجھے کہ لوگ اس بے معنی شعر کی تعریف کر کے ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مگر جب مسلسل اس شعر کی تعریف ہونے لگی تو انھیں سوچنا پڑا کہ اس شعر میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ تو انھوں نے اس شعر کی تخلیق کے دو ڈھائی برس بعد اپنے لیے اس شعر کے معنی طے کیے۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ یہ شعر کس کا ٹھہرا، شاعر کا یا قاری کا؟ اور یہیں سے ادب کو سمجھنے کی راہ نکلتی ہے۔

اس لیے میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ ادب جب تک قاری تک نہیں پہنچ جاتا تب تک اس کے ادب ہونے میں ہی شبہ ہے اور اس کے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ قاری بڑی حد تک تخلیقیت میں ادیب و شاعر کا معاون ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ تخلیقیت میں قاری ادیب کا معاون ہے تو لکھے ہوئے الفاظ کی بہ نسبت سنیما کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ سنیما ان لوگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ہندوستان جیسے غیر تعلیم یافتہ ملک میں سنیما کے آرٹ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اگر ہم تعلیم یافتہ ہندوستانی کو ہی لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چودہ بڑی زبانوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ چودہ زبانیں چودہ خطوط میں لکھی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہندی ہے لیکن وہ بھی کتنی بدقسمت۔ ہندوستانیوں میں کتنے فیصد لوگ ہندی پڑھنے والے ہوں گے؟ ڈھائی فیصد، تین فیصد، چار فیصد...... تو باقی کے 96 فیصد لوگوں کا کیا ہوگا۔ ہندوستان کی دوسری بڑی زبان کا اوسط تو اتنا بھی نہیں نکلے گا۔

میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی 96 فیصد آبادی کے لیے

نوٹ: یہ مقالہ راہی معصوم رضا نے 25 نومبر 1991 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک جلسے میں پڑھا تھا۔

چھپا ہوا یا لکھا ہوا لفظ بے معنی ہے۔ لیکن وہی لفظ اگر سنا جائے تو اس کی پہنچ بڑھ جاتی ہے۔ پورے ملک میں ہندی فلموں کی شہرت اس بات کا ثبوت ہے۔

اس وقت غور وفکر کا موضوع یہ ہے کہ سنیما کی پہنچ چھپے ہوئے لفظ سے زیادہ ہے، اس کے لیے ہمارے دانشور چاہے کتنا ہی ناک بھنو چڑھائیں، ادب اور سماجیات کے شعبے فلم جیسی طاقتور ادبی صنف کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ سنیما کی اس بے پناہ طاقت اور مقبولیت کے علاوہ ادب کی تعلیم اور سمجھ کے لیے بھی سنیما کو ادب قبول کرا سے ادب کے نصاب میں شامل کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر میر کے اس شعر کو لیجیے:

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

طالب علم اگر لغت دیکھے گا تو اسے دور، غبار، عشق، ادب اور بیٹھے کے معنی معلوم ہو جائیں گے لیکن شعر پھر بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ 'دور' کا تعلق 'ادب' سے اور ان دونوں الفاظ کے درمیان لفظ 'بیٹھا' بھی ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'غبار' اس سے کتنی دور بیٹھا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ کوئی بھی استاد یہ فیصلہ کیسے کرے گا؟ پھر وہ یہ کیسے بتائے گا کہ 'ادب سے بیٹھنا' کیا ہوتا ہے؟ لیکن اگر یہ شعر ایک تصویر بن جائے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ شعر ایک تصویر بھی ہے اور ایک 'بیان' بھی۔ یہ عشق کو سماج کے دائرے میں لاتا ہے۔ اس طرح اس پر بھی غور کیجیے کہ:

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

یا

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر ہر قدم پہ یاں گھر تھا

یا

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس گل بدن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد میں کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یا

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یا

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

قاری جب اس طرح کے اشعار پڑھتا ہے تو اپنے ذہن میں اس کی تصویر بناتا ہے۔ یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ قاری کو یہ تصویر بنانا سکھائے اور ان سب کے لیے ہمیں سنیما کو نصاب میں شامل کرنا پڑے گا کیونکہ سنیما ایک ایسا آرٹ ہے جو لفظوں چلتی پھرتی، سوتی جاگتی، ہلتی ڈلتی تصویروں میں تبدیل کرانے میں سمجھنے کا کام آسان کر سکتا ہے۔ سنیما سنی سنائی کو آنکھوں دیکھی بنا دیتا ہے اور اس لیے زیادہ معتبر ہو جاتا ہے۔ جب ہماری نانیاں، دادیاں کہانیاں سنایا کرتی ہیں تو شروع میں یہی قبول کرنا پڑتا ہے کہ آنکھوں دیکھی نہیں کہتی کانوں سنی کہتی ہوں، جھوٹے پر خدا کی لعنت، اور تب کہانی شروع ہوا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ اس تمہید کے ساتھ قصہ گو اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتا تھا۔ لیکن اگر کوئی کہانی فلم کے ذریعے دکھائی جا رہی ہے تو اس کے لیے کسی تمہید کی ضرورت نہیں، کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے دیکھنے والا خود ہی دیکھ رہا ہے۔ فلم تو خود دیکھنے والے کی آنکھوں دیکھی ہے۔ اس کے سامنے کردار بنتے بگڑتے ہیں۔ اس کے سامنے ہی وہ ظلم سے لڑتے ہیں یا اسے برداشت کرتے ہیں اور بڑی حد تک وہ خود بھی اس لڑائی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسے کرداروں کے ساتھ رونا آتا ہے، ہنسی اور غصہ آتا ہے۔ یعنی سنیما کی پرچھائیاں پردے سے اتر کر اس تک آ جاتی ہیں اور وہ ان پرچھائیوں سے اپنے دکھ درد کا موازنہ کرتا ہے یا پھر وہ خود ایک پرچھائیں بن کر ان کرداروں میں شامل ہو جاتا ہے۔

سنیما کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا ناظر، ناظرین کا حصہ بھی ہے اور تنہا ناظر بھی۔ وہ اجتماعی طور پر بھی فلم دیکھ رہا ہے اور انفرادی طور پر بھی۔ وہ سبھی کے ساتھ ہنستا ہے اور سبھی کے ساتھ تالیاں بجاتا ہے، سب کے ساتھ ولن کو گالیاں دیتا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس سے تالیاں نہیں بجوا سکتی، اس سے قہقہہ نہیں لگوا سکتی، اس سے گالیاں نہیں دلوا سکتی۔ یہ چیزیں اجتماعی ردعمل کا حصہ ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طاقت تو ٹیلی ویژن میں بھی ہے تو سنیما کی جگہ اسے کیوں نہ نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ جہاں تک ادب کا سوال ہے ٹی.وی. تو لکھے ہوئے لفظ کی مناسبت سے بھی چھوٹا پڑتا ہے۔

ٹی.وی. وسعت کی کمی کی وجہ سے ناظر کو کوئی پراسپکٹو نہیں دے سکتا کیونکہ اس میں لانگ شاٹس ممکن نہیں اور جب تک پوری کائنات آپ کے سامنے نہ ہو ایک ذرے کے مقام کا تعین کیسے کریں گے؟ کلوز اپ میں آپ یہ دیکھ ہی نہیں سکتے کہ اس تنہا ذرے کا کائنات سے کیا رشتہ ہے؟ وہ کائنات کو کیا دے سکتا ہے اور کیا لے سکتا ہے۔ کائنات میں اس کا کیا مقام اور اہمیت ہے۔

سنیما میں پہلے لانگ شاٹس کا تعین کرتے ہیں پھر کیمرہ کسی کردار کے کلوز اپ پر جاتا ہے کیونکہ کلوز اپ یا کلوز اپ شاٹس کسی لانگ شاٹس کا حصہ

ہے۔ کوئی پھر جب خود کو لانگ شاٹس سے کاٹ کر کلوز اپ میں دیکھتا ہے تو وہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ اس لیے لانگ شاٹس سے کٹا ہوا کلوز اپ ایک بہت ہی خطرناک چیز ہے جو غلط ہاتھوں میں پڑ کر آدمی کی اجتماعی اور انفرادی شخصیت کو تباہ کر سکتا ہے۔ بھائیو اور بہنو! ٹی.وی. کے پاس لانگ شاٹس سے کٹا ہوا کلوز اپ اور کلوز شاٹ ہی ہیں اور اسی لیے میں ٹی.وی. کو ادب کا حصہ ماننے سے جھجکتا ہوں اور اسے ادب کے نصاب میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی طاقت نہیں، وہ تو دودھ کی ایک بوند کو اس بھرم میں ڈال سکتا ہے کہ وہ دودھ کی ایک بوند نہیں بلکہ پوری جھیل ہے۔ مگر سنیما دودھ اور پانی ملے دودھ میں فرق کر سکتا ہے۔ اس لیے تعلیم افہام و تفہیم سنیما ایک بہتر ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہم اس بات کو قبول کر لیں تو ہمیں سنیما اور اس کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا اور جس طرح ہم ادب کی دوسری اصناف کا تعارف پیش کرتے ہیں اسی طرح سنیما کو بھی متعارف کرنا پڑے گا اور اس کے خاص قواعد اور تکنیک کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ آج جس طرح ہمارے اساتذہ غزل، قصیدہ، مثنوی، کہانی یا ناول پڑھنا سکھاتے ہیں اسی طرح سنیما دیکھنا اور سمجھنا سکھانا پڑے گا۔ یہ طے کرنا ہوگا کہ فلم کا لکھنے والا کون ہے؟ جو اسکرپٹ لکھتا ہے یا وہ جو کیمرے کے قلم سے تصویروں کے خط میں اسی اسکرپٹ کو دوبارہ لکھتا ہے یا وہ ہیرو ہیروئنیں جنھوں نے فلم میں کام کیا یا وہ ہدایت کار جس نے وہ فلم بنائی جس میں اس کے نظریے کی دھارا جاری ہے۔

لیکن سب سے پہلے ہمارے دانشوروں کو فلم سے متعلق اپنا نظریہ بدلنا ہوگا۔ وہ فلم کا نام سنتے ہیں ناک بھنوں چڑھاتے ہیں جیسے فلموں سے متعلقہ لوگ اس مہذب سماج میں شودر ہوں اور جو منڈل کمیشن کے لاگو ہو جانے کے بعد بھی اپنا نظریہ بدلنے کو تیار نہیں۔ میں ایسے بزرگوں اور دوستوں سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر فلمیں اتنی ہی خراب اور صحت کے لیے مضر ہیں تو آپ اس کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ مگر آپ کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ نہ آپ فلمیں دیکھتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک فلم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہدایت کار رمیش سپی کی فلم تھی اور سلیم جاوید نے اس کا اسکرپٹ تیار کیا تھا۔ اس فلم میں دھرمیندر، امیتابھ بچن، سنجیو کمار، ہیما مالنی اور جیا بھادوڑی نے کام کیا تھا۔ اس فلم کا نام ''شعلے'' تھا۔ میں نے ابھی ابھی جن دانشوروں کا ذکر کیا تھا انھوں نے تو یہ فلم دیکھی بھی نہ ہوگی۔ یہ فلم ایک تھیٹر میں پانچ برس چلی تھی۔ مگر کیا ہمارے دانشوروں نے غور کیا کہ یہ فلم اتنی مشہور کیوں ہوئی؟ یہ سوال اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ سوال کہ گلشن نندا، راجندر سنگھ بیدی سے زیادہ کیوں مشہور تھے۔ شہرت یا مقبولیت اپنے آپ میں ایک قدر ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو گلشن نندا اور ابن صفی کے پاس تھی اور پریم چند و راجندر سنگھ بیدی کے پاس نہیں تھی؟ وہ کیا چیز ہے جو من موہن دیسائی، ناصر حسین اور پرکاش مہرا کے پاس ہے اور ستیہ جیت رائے، مرنال سین اور رشی کیش مکھر جی کے پاس نہیں ہے۔ بھائیو اور بہنو! وہ چیز ہے مقبولیت۔ مقبولیت جو 'میرا گاؤں میرا دیش'، 'امر اکبر انتھونی' اور 'شعلے' کو ملی اور 'اس کی روٹی'، 'آکروش' اور 'گرم ہوا' کو نہیں ملی۔

مسئلہ یہ ہے کہ نام نہاد دانشور لوگ مقبولیت کو بہت کمتر شئے سمجھتے ہیں مگر وہ اس کی طاقت سے انجان ہیں۔ گاندھی جی بہت مشہور تھے، نہرو جی بہت مشہور تھے، امیتابھ بچن بہت مشہور ہیں، شری دیوی بہت مشہور ہیں۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو تک تو وہ سر ہلائیں گے لیکن امیتابھ اور سری دیوی کا نام آتے ہی ناک بھنوں چڑھائیں گے۔ ان کا یہ رویہ غیر سائنسی اور جاہلانہ ہے۔ میں یہ تلخ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ اپنی منجمد قابلیت کے غلام ہیں۔ یہ لوگ کہہ دیں گے کہ ''شعلے'' ایک اسکرپٹ فلم ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ یہ کہہ رہے ہیں تو پھر آپ ''شعلے'' کو سمجھتے ہی نہیں۔ ''شعلے'' ایک اسکرپٹ فلم نہیں، بہت ہی کامیاب اہم اور سماجی بیان ہے۔ چار جملوں میں ''شعلے'' کی کہانی یہ ہے:

سنجیو کمار ایک ایماندار پولس افسر ہے جس نے گبر سنگھ ڈاکو کو گرفتار کر کے جیل بھجوایا تھا۔ گبر سنگھ جیل سے فرار ہوا اور سنجیو کمار کے پورے خاندان کو قتل کر دیا اور سنجیو کمار کے دونوں ہاتھ کاٹ لیے۔ یہ ایماندار پولس افسر پولس کے پاس فریاد لے کر نہیں گیا، قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ اسے جیل میں سزا کاٹتے ہوئے دو ملزم یاد آتے ہیں۔ یہ مجرم ہیں دھرمیندر اور امیتابھ بچن۔ یہ ایماندار پولس افسران دو مجرموں کو اپنے دو ہاتھ بناتا ہے اور گبر سنگھ کا مقابلہ کرتا ہے۔

یہ فلم بیان دے رہی ہے کہ قانون اور پولس پر سے لوگوں کا بھروسہ اٹھ گیا ہے۔ کیا یہ بیان اہم نہیں ہے۔ کیا سماجیات کے پنڈتوں نے اس بیان اور اس کی اہمیت کو سمجھا۔ سب سے اہم بیان یہ ہے کہ کیا یہ بیان سچا نہیں ہے؟ کیا ہمارے سیاسی اور سماجی بزرگوں اور دوستوں کے لیے یہ قابل غور نہیں ہے کہ جس فلم میں دھرمیندر اور امیتابھ جیسے فنکار کام کر رہے ہوں اس فلم سے ولن گبر سنگھ کو اتنی شہرت کیوں ملی کہ پارلے بسکٹ کا اشتہار بن گیا۔ میں گبر سنگھ کا یہ اشتہار دیکھ کر ڈر گیا تھا کیونکہ ان اشتہاروں کے معنی یہ تھے کہ ہمارے ملک میں راون شری رام سے زیادہ مشہور ہے لیکن ہمارے دانشوروں نے اس پر غور ہی نہیں کیا کیونکہ یہ بیان ایک فلم نے دیا تھا۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس فلم کے پروڈیوسر رمیش سپی نے یہ سوچا تھا یا نہیں۔ ممکن ہے رمیش سپی کے لیے بھی 'شعلے' جذبی صاحب کے اس شعر کی

طرح ہی ہو جو ان کے خیال سے بے معنی تھا لیکن درحقیقت وہ با معنی تھا۔ یعنی ہم پھر قاری اور ناظر تک آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاری اور ناظر ادیبوں سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے ایک باخبر اور جانکار قاری یا ناظر کی کمی سے ادب کی پرورش ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔

سنیما کا ناظر سنیما سے بالکل ناواقف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ قبول اور غیر قبول کے اپنے ذاتی معیار کی کسوٹی پر سنیما کو رد و قبول کرتا ہے۔ جب کہ ہمارا دانشور طبقہ یہ فرض پورا نہیں کرتا۔ پروفیسر عرفان حبیب جاسوسی ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے اور اس کے حاشیے پر نوٹ لکھا کرتے تھے کہ ہیرو، جاسوس سے کیا غلطی ہوگئی۔ یہاں اہم جاسوسی ناول نہیں ہے بلکہ تفتیشی مزاج اہم ہے اور ایک مورخ کے لیے یہ ضروری ہے۔ دھیرے دھیرے علم کلوز اپ بنتا جا رہا ہے اپنے لانگ شاٹ سے کٹا ہوا۔ یہ بات کہہ کر میں جدید مورخوں پر حملہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایک خبر سنا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نورالحسن سابق صدر شعبۂ تاریخ نے کیا کیا؟ وہ مغربی بنگال کے گورنر ہو گئے۔ مگر تاریخ کا کیا بنا؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں ذاتی مفاد ذہنی مفاد سے ٹکراتے ہیں اور خسارے میں دانشور ہی رہتا ہے۔ اس لیے کلوز اپ اور لانگ شاٹ کے رشتے کو سمجھنا ہے تو ہم سنیما کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس رشتے کو سمجھنے کے لیے سنیما کو سمجھنا ضروری ہے۔

سنیما ادب کی ایک صنف ہے۔ اسے بھی انھی تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے جو دیگر ادبی اصناف پورا کرتی ہیں۔ یعنی وہ اشتہار یا پروپگینڈہ نہیں ہے، وہ لوگوں کو چین و سکون اور خوشی فراہم کرتا ہے اور اس خوشی سے وہ سماج کو صحت مند بنانے کی جنگ لڑتا ہے۔ جس طرح کوئی نظم، ناول، کہانی یا ادب جو اس فرض کو پورا نہیں کرتا وہ بے کار ہے، اسی طرح جو فلم اس فرض کو پورا نہیں کرتی وہ بیکار ہے۔

اس بات سے شاید آپ انکار نہ کریں لیکن میں اسے آگے بڑھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح ادیب یا فنکار کا ایک نظریہ ایک پائنٹ آف ویو ہونا چاہیے اسی طرح قاری کا بھی ایک نظریہ ہونا چاہیے۔ تو اس قاری یا ناظر کے نظریے کی ٹریننگ کون کرے گا؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ ذمہ داری بھی ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ہے اور اسی لیے میں یہ گزارش کرنے آیا ہوں کہ سنیما کی طرف پیٹھ کر کے نہ بیٹھیے۔ یہ بہت ہی طاقتور ادبی صنف ہے۔ یہ سماج کو بنا بھی سکتا ہے اور برباد بھی کر سکتا ہے۔ اسے وسٹڈ انٹریسٹ کے ہاتھ میں چھوڑ کر ہمارے دانشور اور تعلیمی ادارے سماج دشمنی کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے سنیما کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہ کی اور مثال کے لیے کسی ولی رائے، کسی ستیہ جیت رائے، اور کسی گووند نہلانی کو بھی وہی اعزاز دینا قبول نہ کیا جو غالب، میر یا تلسی داس کو دیتے ہیں تو سنیما ایک جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گا اور سماج میں آگ لگا دے گا۔

ابھی مثال کے طور پر میں نے جو نام لیے ہیں وہ سب ہدایت کار تھے یا نہیں۔ میں نے صرف ہدایت کاروں کے نام اس لیے لیے ہیں کہ میں ہدایت کار کو ہی فلم کا مصنف مانتا ہوں۔ اور نام لینے میں یہ احتیاط ہوتا ہے کہ صرف ان ہدایت کاروں ہی کے نام لوں جن کے ساتھ میں نے کام نہیں کیا ہے۔ میں نے یہ اس لیے ضروری سمجھا کہ آپ مجھ پر جانبداری کا الزام نہ لگائیں۔

اب میں یہاں چار فلموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ محبوب خاں مرحوم نے ایک فلم بنائی جس کا نام انھوں نے ''عورت'' رکھا۔ انھوں نے یہی فلم دوبار بنائی مگر نام بدل دیا۔ اس بار انھوں نے اس کا نام ''مدر انڈیا'' رکھا۔ اسی ہدایت کار نے اسی فلم کو دوبارہ کیوں بنائی اور بنائی بھی تو اس کا نام کیوں بدل دیا؟ ''عورت'' کو ''مدر انڈیا'' کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جنرل کو پارٹی کولر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہی نظریہ اور پرسپکٹو کی منزل ہے۔ عورت میں محبوب خاں نے صرف ایک چیز بڑھایا ہے جو ماں کی شکل میں ہے، نہر کا پانی کھول رہا ہے، یہ بہتا ہوا آگے بڑھتا ہوا پانی ''عورت'' میں نہیں تھا۔ واضح ہو کہ یہ بہتا ہوا پانی کسی دریا کا نہیں ہے، انسان کی بنائی ہوئی ایک نہر کا ہے۔ ''مدر انڈیا'' کا یہ بیان عورت میں نہیں ہے تو عورت کا مدر انڈیا بن جانا محبوب کی روحانیت کی ارتقا کی دلیل ہے اور وہ نہر ایک ایسی علامت ہے جو قربانیوں اور محنت کی توقع کرتی ہے اور اس کا بہتا ہوا پانی مستقبل کی طرف ہمارے سفر کی علامت بن جاتا ہے۔

میں جن دو اور فلموں کی بات کرنا چاہتا ہوں ان میں ایک بمل رائے کی بنائی ہوئی ''دیوداس'' دوسری ولی رائے کی بنائی ہوئی ''دیوداس''۔ یہ دونوں فلمیں ایک ہی ناول پر بنائی گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ دو سمجھدار ہدایت کاروں نے بنائی ہیں۔ ان دونوں فلموں پر بحث کا یہ موقع نہیں مگر ایک ہی کہانی پر بننے والی یہ دونوں فلمیں اتنی ہی مختلف ہیں جتنی ایک ہی کہانی یا واقعے یا قصے پر لکھے جانے والے انیس، دبیر، یونس اور وحید کے مرثیے۔ اور ان دونوں دیوداسوں کا ذکر میں نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کیا ہے کہ ہدایت کار ہی فلم کا مصنف ہوتا ہے۔

ویسے سنیما کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسکرپٹ رائٹنگ،

سنیما فوٹوگرافی، اڈیٹنگ، اداکاری اور ہدایت۔ ایڈیٹر اور سنیما فوٹوگرافر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ فلم کے مصنف ہیں لیکن اسکرپٹ رائٹر کبھی کبھی خود کو فلم کا مصنف سمجھ بیٹھتا ہے۔ ہمارے وقت میں اس کی سب سے بڑی مثال سلیم جاوید ہیں۔ سلیم جاوید نے ''دیوار'' جیسی فلم کا اسکرپٹ لکھا مگر کیا فلم ''دیوار'' وہی ہے جو انھوں نے لکھی؟ اداکاروں نے جو ڈائیلاگ بولے اس کا انداز کس نے طے کیا؟ اس کے لکھے ہوئے مناظر کو کس نے شاٹ میں تقسیم کیا؟ فیصلہ کس نے کیا کہ کس شاٹ میں کیمرہ کہاں ہوگا اور اس میں کون سا لینس لگا ہوگا؟ اور جب شاٹ لے لیا گیا تو 'اوکے' یا ونس مور کس نے کیا؟ دیکھنے والے سلیم جاوید کا اسکرپٹ نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ''دیوداس'' ناول کا مصنف سلیم جاوید بڑا ادیب تھا لیکن ان دونوں فلموں میں ایک بروا اور ایک وِل رائے کی فلم کہی جاتی ہے۔

مصنف اور ہدایت کار کی کشمکش کی سب سے اچھی مثال گلزار ہیں۔ گلزار مصنف بھی ہیں اور ہدایت کار بھی۔ انھوں نے جب دوسروں کے لیے لکھا تو ہدایت کاروں نے ان کی اسکرپٹ پر اچھی فلمیں بنائیں مگر جب وہ اپنے لیے لکھتے ہیں تو مصنف گلزار، ہدایت کار گلزار پر حاوی ہو جاتا ہے، نتیجے میں فلم کمزور ہو جاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اس کی دوسری مثال ہیں۔ ان دونوں ہدایت کاروں کی فلمیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ جب ہدایت کار کا قد اپنے مصنف اور ہدایت کاروں سے چھوٹا پڑ جاتا ہے تو فلمیں اچھی نہیں بن پاتیں۔ اور آج کل ہندی فلمیں اسی دور سے گزر رہی ہیں۔ آج ہدایت کار کا قد فلم اسٹار سے بہت چھوٹا ہو گیا ہے اسی لیے کامیاب اور اچھی فلمیں بہت کم بن پا رہی ہیں۔

میں فلم اسٹار، اسکرپٹ رائٹر، کیمرہ مین یا ایڈیٹر کی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا، مگر یہ سب کے سب ہدایت کار کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہدایت کار کی خواہش کی تکمیل کرنا ان سب کا فرض ہے۔ ناظر صرف وہی دیکھتا ہے جو ہدایت کار دکھلاتا ہے۔ ایڈیٹر ایک فریم نہ تو کم کرسکتا ہے نہ بڑھا سکتا ہے۔ اسکرپٹ رائٹر ایک لفظ نہ تو کم کرسکتا ہے نہ اضافہ۔ کیمرہ مین ہدایت کار کی مرضی کے بغیر کیمرے کو کہیں رکھ نہیں سکتا۔ اگر ہدایت کار کلوز شاٹ چاہتا ہے تو کیمرہ مین اسے کلوز اپ نہیں کرسکتا۔

فلم کے اندر بڑی دیواریں ہیں۔ وہ دیواریں نہ توڑی جاسکتی ہیں نہ پھلانگی جاسکتی ہیں۔ فلم ایک آرکسٹرا ہے۔ ہر اداکار اپنا اپنا ساز بجا رہا ہے۔ مگر اس میوزک کا مصنف کنڈکٹر ہے جس کے اشاروں پر ساز بجتے ہیں۔ کوئی ہدایت کار سلیم جاوید، کملیش پانڈے یا قادر خاں سے اچھا نہیں لکھ سکتا۔ کوئی ہدایت کار، من موہن سنگھ، ندیم خاں اور جال مستری سے اچھا سنیما فوٹوگرافر نہیں، کوئی ہدایت کار، دلیپ کمار، امیتابھ بچن، نصیر الدین شاہ، اوم پوری، نرگس، وحیدہ رحمان، ریکھا، شبانہ اعظمی اور جیا بھادوڑی سے اچھی ایکٹنگ نہیں کرسکتا۔ کوئی ہدایت کار مدھو بالا سے زیادہ خوبصورت نہیں پھر بھی فلم کا مصنف نہیں ہے۔ دلیپ کمار اپنے دیے ہوئے شاٹ سے لاکھ مطمئن ہوں لیکن اگر ہدایت کار مطمئن نہیں ہے تو دلیپ کمار کو ری ٹیک دینا ہی پڑے گا۔

اس لیے اگر ایک بار یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ سنیما کا مصنف کون ہے تو سنیما کو سمجھنے کا کام لگ بھگ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ سنیما کے مصنف کو طے کیے بغیر اس کی زبان ہی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہی ایک ایسا آرٹ ہے جس میں کئی فنکار حصہ لیتے ہیں۔ ہدایت کار ایسا تنہا فنکار ہے جو ناظرین کو بھی اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کس کے لیے فلم بنا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ناظرین کا ذہن خوشی کے کن راستوں سے مانوس ہے۔

میں سنیما کو ادب کا حصہ سمجھتا ہوں اسی لیے اس بات پر زور دیتا ہوں کہ اسے ادب میں شامل کر لینا چاہیے۔ ادب کے انتہا پسند اسے ادب ماننے کے لیے اس لیے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی تخلیق میں غیر ادبی لوگوں کا ہاتھ بھی ہوتا ہے۔ تو کیا میں یہ سوال کرسکتا ہوں کہ پھر آپ نے ڈرامے کو ادب کی سنسان زندگی میں آنے کی اجازت کیوں دی؟ ڈرامہ بھی پڑھنے کی چیز نہیں ہے، یہ بھی سنیما کی طرح دیکھنے کی چیز ہے۔ اس میں بھی ایڈیٹر اور کیمرہ مین کے علاوہ بھی ہوتے ہیں..... تو اگر ڈرامہ ادب کے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ہے تو سنیما کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟ سنیما ڈرامے کا اگلا قدم ہے۔

یہ سمجھیے کہ جیسے اچھی یا بری غزل ہوتی ہے، اچھا یا برا ناول ہوتا ہے اسی طرح اچھی یا بری فلم بھی ہوتی ہے۔ آپ جب تک طلبہ کو یہ نہ بتائیں گے کہ اچھی بری فلم میں فرق کرنے کا طریقہ کیا ہے تب تک وہ بلیک میں بری فلموں کے ٹکٹ خرید کر دیکھتا رہے گا اور اچھی فلموں کے مقابلے بری فلموں کی تعداد بڑھتی رہے گی۔ اسی لیے میں تو یہی چاہتا ہوں کہ فلم کو ادب کے نصاب میں شامل کیا جائے۔

(بشکریہ ''ہمعصر قدم'' شمارہ نومبر 2001 تا اکتوبر 2002)

□□□

رابطہ مترجم:
F-58, Sector-40
Noida-201301 (U.P.)

ابوالکلام

ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات

ترجمے کے بغیر دنیا کے بیشتر کام نہیں چل سکتے۔ عصر حاضر غیر ملکوں سے تمام علمی، فنی، سائنسی اور تکنیکی معلومات ہمیں ترجموں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی رہی ہیں۔ اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا دنیا کے تمام ملکوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ نئے 'علوم'، نئی نئی دریافتوں اور بصیرتوں کو بڑے پیمانے پر کم سے کم وقت میں حاصل کرلیں اور یہ کام ترجمے کے ہی ذریعے سے ممکن ہے۔ گوئٹے کا قول ہے کہ ''جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔'' گوئٹے نے یہ بات اٹھارھویں صدی میں کہی تھی جب زیادہ تر علمی کارنامے لاطینی میں تصنیف ہوتے تھے اور شائقین انھیں لاطینی ہی میں پڑھتے بھی تھے۔ اب تو نئے علوم کی کتابیں انگریزی، فرانسیسی، جاپانی، جرمنی، روسی اور چینی میں بھی تصنیف ہو رہی ہیں۔ لہٰذا اب ترجمے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ''پار لے جانا''۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے۔ لغات میں اس کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کے احوال کا بیان اور یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔ یعنی ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے کسی تصنیف کو اس کی جملہ خصوصیات کے ساتھ اصل زبان سے کسی دوسری زبان میں کچھ اس طرح منتقل کیا جائے، جس کے باوصف ترجمے کی زبان میں اصل تصنیف دوبارہ اپنی پرانی شکل میں زندہ جاوید ہو جائے۔

ترجمہ وہ دریچہ ہے، جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں، لیکن جدید عہد میں یہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ترجمے کے بغیر ہماری اپنی زبان بھی ترقی نہیں کرسکتی۔ ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ اور تصورات زبان میں داخل ہوتے ہیں۔ اردو نثر میں سجاد حیدر یلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور حسن عسکری اور شاعری میں اقبال سے لے کر شان الحق حقی تک نے تراجم کیے ہیں۔ فرانسیسی میں بودلیر سے لے کر آندرے ژید تک نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی۔ بلکہ آندرے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے۔

ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ کام بازار سے لے کر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لے کر ٹیلی ویژن تک کسی نہ کسی شکل میں ہوتا ہے۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار بہتر ہوسکتا ہے۔ اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی، ایک کارآمد ہنر کی طرح سے ہی سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جاسکے۔ جس قدر لگن اور محنت کے ساتھ مترجم، ترجمہ کرتا جائے گا اس کے فن میں نکھار آتا جائے گا۔ مترجم کے لیے متن کی زبان اور اپنی زبان پر عبور کے ساتھ ساتھ موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے۔

ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تو مشینی ترجمہ ہے اور دوسرا تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا، تاکہ تعلیمی، تکنیکی، معلوماتی اور تشہیری مواد کم سے کم وقت میں تیار ہوسکے۔ تقریباً نصف صدی پہلے جب ایک ''خودکار مترجم'' تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تو یہ توقع پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا، جس کے ایک طرف فوٹو کاپی مشین کی طرح کسی زبان کے متن کو داخل کیا جائے گا تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ فوراً باہر نکل آئے گا۔ اس میں ماہرین لسانیات نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کرکے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام Feed کرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین مترجمین اور ترجمے کے مدیروں کی ضرورت برقرار رہے گی۔ مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا۔ تاہم اس کا دائرۂ کار ایسی زبان تک ہی محدود رہے گا، جس میں زبان کو تہہ در تہہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو۔

تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے، جس کی پیش بینی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بلفظ مماثلت نہیں ملتی جو بامعنی ہو اور درست بھی تاہم تخلیقی ترجمہ کرنے والوں نے ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں، جہاں نہیں تھیں وہاں انھوں نے اپنے تخیل سے پیدا کرکے دکھائی ہیں۔

تخلیقی ترجمے سے ایک دوسری مراد ادبی اور تخلیقی تحریروں کے تراجم ہیں اور انھی پر سب سے زیادہ اختلافی باتیں ہوتی ہیں، کیوں کہ سائنسی یا علمی

تحریروں کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحوں پر تو اختلاف ہوسکتا ہے، مفہوم کی ترسیل میں فرق نہیں ہوتا لیکن ادبی ترجموں میں اصل جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب یہ اعتراض کیا جائے کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم یا تحریر کا مزاج تو ترجمے میں آیا ہی نہیں۔ پھر اصناف کی باریکیاں بھی اکثر ترجمے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ کہیں مشکل ہے، کیوں کہ غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی مزاجی کیفیت کا ترجمہ آسان نہیں۔

ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ یہ دو تہذیبوں اور دو زبانوں کے درمیان اتحاد کا ایک عمل ہے اور یہ اتحاد یک طرفہ نہیں ہوسکتا۔ زبان کی سرحدوں کو پار کرکے باہم مفاہمت کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نقل کلام کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ظاہر ہوا تھا اور یہ بھی لازم ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تھیوڈر رساوری نے ''آزاد اور لفظی ترجمہ' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جس کا آصف جمیل نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کو پروفیسر قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب 'ترجمے کا فن اور روایت' میں شامل کیا ہے۔ تھوڈر کا کہنا ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو ترجمے کے فن کے بارے میں ہر ممکن معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں ترجمے کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن ترجمے کے ایسے اصول ابھی تک وضع نہیں کیے گئے جنھیں دنیا کے تمام مترجم تسلیم کرتے ہوں۔ تمام فنون میں ایسے ماہرین کی تعداد خاصی ہوتی ہے جو متعلقہ فن کے اصول اور نظریات مرتب کرتے ہیں لیکن اس فن کے لیے باقاعدہ اصول ابھی تک مرتب نہیں کیے گئے۔ جن لوگوں نے ترجمے کے کچھ اصول بنائے ہیں یا جنھیں ترجمے کا عملی تجربہ ہے ان میں بھی آپس میں بہت اختلاف ہے۔ انھوں نے جو اصول مرتب کیے ہیں ان میں اتنے اختلافات ہیں کہ کوئی مترجم جب ان اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس اصول کو مانے اور کس کو نہ مانے۔

تھیوڈر نے ترجمہ نگاری کے درج ذیل اصول مرتب کیے ہیں:

1. ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2. ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔
3. ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4. ترجمے کو ترجمے کی ہی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5. ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6. ترجمے کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔
7. ترجمے میں اصل تصنیف میں حذف و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔
8. ترجمے میں اصل متن میں حذف و اضافہ کبھی ممکن نہیں۔
9. نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔
10. نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

تھیوڈر نے مختلف اصولوں کی جو فہرست دی ہے، اس سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ میں اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کے صاحب زادے شاہ محمد رفیع الدین کے قرآن شریف کے ترجمے کا ذکر کروں گا۔

یہ ترجمہ 1776 میں کیا گیا تھا۔ اس زمانے تک اردو نثر خاصی صاف، سادہ اور رواں ہو چکی تھی۔ لیکن چوں کہ شاہ محمد رفیع الدین کو یہ خیال تھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ترجمے میں ایسی کمی وبیشی راہ نہ پا جائے جس سے قرآن شریف کا مفہوم بدل جائے۔ اس لیے انھوں نے یہ اہتمام کیا کہ قرآن شریف کے ہر لفظ کا ترجمہ عربی عبارت کے مطابق ہو۔ انھوں نے قرآن شریف کے ہر لفظ کے نیچے اردو کا مناسب ترین لفظ لکھ دیا اور عبارت کی وضاحت نہیں کی۔ اس اہتمام سے ترجمے کا بیشتر حصہ اردو محاورے کے خلاف ہو گیا اور بعض مقامات پر اصل عبارت کی انتہائی پابندی کرنے کی وجہ سے عبارت گنجلک ہو گئی۔ چوں کہ اصل عبارت کی وضاحت کے لیے الفاظ نہیں بڑھائے گئے، اس لیے معنی و مفہوم واضح نہیں ہوئے اور ترجمہ ناقابلِ فہم ہو گیا۔ عربی میں فاعل اور مفعول سے پہلے فعل آتا ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین نے ترجمے میں الفاظ کی یہی ترتیب رکھی، جو اردو صرف و نحو کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے اس ترجمے کی یہ تاریخی اہمیت ہے کہ اردو میں قرآن کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ نقشِ اول میں جو کمی رہ جاتی ہے، وہ اس ترجمے میں بھی ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر نے جب شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی کوتاہیاں دیکھیں تو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ ترجمہ بہت زیادہ لفظی ہونے کی وجہ سے خلافِ محاورہ اور بیشتر مقامات پر ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ چنانچہ 1790 میں انھوں نے 'موضح القرآن' کے نام سے خود قرآن شریف کا ترجمہ شائع کیا۔

شاہ عبدالقادر نے لفظی ترجمے پر آزاد ترجمے کو ترجیح دی۔ یہ آزاد ترجمہ بس اس حد تک آزاد ہے کہ انھوں نے یہ خیال رکھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھنے والا قرآن کو آسانی سے سمجھ سکے، اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ قرآن شریف کا مفہوم ایسی اردو میں بیان ہو جائے کہ پڑھنے والا اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ انھوں نے عربی الفاظ کے لیے ایسے اردو الفاظ کا انتخاب و التزام کیا جو عوام میں رائج تھے۔

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ:

1. یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ مترجم اصل متن کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ہم

معنی، لفظ لکھ دے۔ اس طرح کے ترجمے سے عبارت گنجلک ہو جاتی ہے، بیشتر مفاہیم ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصل متن کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

2. مترجم یہ خیال رکھے کہ وہ کن لوگوں کے لیے کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے۔ اگر وہ ایسے لوگوں کے لیے ترجمہ کر رہا ہے جو فارسی اور عربی سے واقف ہیں تو اس کو یہ آزادی ہے کہ ترجمے میں عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کرے، جو اس کے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آسکیں۔ مترجم اگر ان زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے اجنبی الفاظ کا استعمال کرے گا تو ترجمہ مشکل ہوگا اور اجنبی الفاظ کی وجہ سے عبارت میں روانی نہیں رہے گی۔

3. اگر ترجمہ عام لوگوں کے لیے کیا جا رہا ہے تو ترجمے کی زبان آسان اور عام ہو۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں، جنھیں کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکیں۔ عربی اور فارسی الفاظ سے بوجھل ترجمے کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کے قارئین کا حلقہ بہت پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے۔ اگر زبان آسان اور عام فہم ہو تو ہر طبقے کے لوگ ترجمے کو شوق سے پڑھیں گے۔

ترجمے کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ترجمہ ایسا صاف اور سلیس ہونا چاہیے کہ وہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جا سکے۔ ایسا ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسی دو زبانیں نہیں ہیں، جن میں باہم تمام الفاظ کے مترادفات موجود ہوں، اگر مترجم یہ کوشش کرے کہ ترجمہ اصل عبارت سے قریب تر رہے اور وہ لفظی ترجمہ کرے تو اس میں یقیناً اصل تصنیف کی روانی نہیں ہوگی۔ یہ صرف سائنسی، تکنیکی اور ریاضی کی کتابوں میں تو ممکن ہے لیکن ادبی کتابوں میں اس لیے ممکن نہیں کہ ہر زبان کا مصنف اپنی عبارت میں ایسے الفاظ، محاورے، کہاوتیں اور روزمرہ استعمال کرتا ہے، اسی لیے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ترجمہ، اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔ اس صورت میں مترجم پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ایک ذمے داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسا ترجمہ کرے جو منشائے مصنف کے مطابق ہو، یعنی ترجمہ اصل تصنیف سے قریب ترین ہو۔ دوسری ذمہ داری 'اسلوب کی جھلک' کا اہتمام اگر مترجم بحسن و خوبی کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ ترجمہ معیاری ہوگا۔

نظم کے ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نثر میں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے اور بعض اوقات ناممکن کی حد تک دشوار ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد جانسن کا قول ہے کہ ''نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا'' اگر نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو کچھ حد تک قابلِ قبول ہوگا۔ اگر نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے تو اصل نظم کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی، کیوں کہ اس طرح کے ترجموں میں اصل متن میں شاعر کچھ کہتا ہے اور مترجم کچھ اور ترجمہ کرتا ہے۔ نظم میں عام طور سے شاعر اپنے خیال کو شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ خیال کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو جاتے ہیں، اسی لیے شاعروں کے کلام کی شرح لکھی جاتی ہے۔ غالب کے اردو کلام کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور ان شرحوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اشعار کو اپنے عہد کے متنوع تقاضوں اور اپنی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی لیے ایک ہی شعر کے کئی مفاہیم رائج ہو جاتے ہیں۔

اردو کے بڑے ماخذ تین ہیں۔ فارسی، عربی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ سے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ فارسی زبان، اپنی لطافت، شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو ادائیگی مفاہیم کے لحاظ سے موزوں ہوتے ہیں۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ سیکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ بلا تکلف اردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو ہو بہو استعمال ہوتے ہیں۔ دوئم وہ جو اردو لب و لہجے کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جا سکتے ہیں۔

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے الگ الگ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں درج ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

1. ترجمہ لفظی ہونا چاہیے۔
2. حتی الامکان عام فہم۔
3. سبک اور سادہ۔

اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کر کے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ مضحکہ خیز ہوگا۔ لیکن ان کے محلِ استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے، جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے۔ اور لفظ عریاں میں اس سے بھی کم ہے۔ مطلق لفظ کا ترجمہ ہو یا عبارت کا اس وزن اضافی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

الفاظ کی بہ نسبت عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ

اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ قائم ہوا تو وضع اصطلاحات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ادارے سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوا، ان میں زیادہ تر کتابیں انگریزی کی تھیں۔ لہٰذا وضع اصطلاحات کا کام شروع کیا گیا تو عام طور سے انگریزی اصطلاحات کا مسئلہ سامنے رکھا گیا۔ دارالترجمہ میں جن علما کا تقرر کیا گیا تھا، انھیں عام طور سے عربی اور فارسی پر قدرت حاصل تھی، اس لیے فطری طور پر ان کا رجحان ان زبانوں کی طرف تھا، تاہم دارالترجمہ کے معزز اراکین نے کثرت رائے سے یہ مسئلہ اس طرح طے کیا کہ عربی و فارسی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو میں اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ انگریزی اصطلاحات کی جگہ عربی اور فارسی الفاظ کی مدد سے اردو اصطلاحات وضع کرنے میں مدد لی گئی۔ دارالترجمہ سے جن کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، ان میں ایسی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا، جو اردو والوں کے لیے اجنبی تھیں، چنانچہ یہ دارالترجمہ سے باہر مقبول نہیں ہوئیں اور پھر ان افراد یا اداروں نے جو ترجمے کے کام میں مصروف تھے، انفرادی طور پر اپنی اصطلاحیں وضع کیں۔ اب اردو میں بیشتر ایسی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں، جن پر ادبا و محققین متفق نہیں ہیں۔

یہاں مولانا وحید الدین سلیم کی کتاب 'وضع اصطلاحات' کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے یہ کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی تھی اور انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا تھا۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں اصطلاحیں وضع کرنے کے درج ذیل اصول بیان کیے گئے ہیں۔

1. انگریزی اور دوسری زبانوں کی بنیادی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے تو پہلے وہ الفاظ لیے جائیں جو اردو میں مستعمل ہوں۔ مثلاً Acid کے لیے تیزاب، Hospital کے لیے اسپتال، Kerosine Oil کے لیے مٹی کا تیل، glass کے لیے شیشہ، Butter کے لیے مکھن، Wire کے لیے تار، Medicine کے لیے دوا، Aerodrome کے لیے ہوائی اڈہ وغیرہ۔
2. پھر ایسے الفاظ یا اصطلاحات لی جائیں جو بنیادی طور پر انگریزی الفاظ پر مشتمل ہوں لیکن ان کا تلفظ یا معنی بدل گئے ہوں۔ مثلاً Match Box کے لیے ماچس، Lantern کے لیے لالٹین، Box کے لیے بکس۔
3. پھر یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہمارے مطلب کے ایسے الفاظ جنھیں ہم اصطلاحات کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، انھیں جوں کا توں لے لیا جائے۔
4. انگریزی کے وہ الفاظ یا اصطلاحیں جو اردو میں اپنے اصل تلفظ کے ساتھ استعمال ہو رہی ہیں، ان کو بھی جوں کا توں رکھا جائے۔ مثلاً ڈاکٹر، نرس، انجینئر، ٹیکسی، کار، ریڈیو، ٹی.وی. وغیرہ۔
5. اور اگر ان میں سے اصول کے مطابق ہمیں اصطلاحیں نہیں ملتیں تو ان کے لیے نئی اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں، اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ اصطلاحات آسان ہوں اور ان میں انگریزی، عربی، فارسی کے ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو جو عام طور سے اردو میں سمجھے جاسکتے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے بڑے پیمانے پر مختلف علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا ہے اس کام کے لیے ضروری تھا کہ مختلف سائنسی، تکنیکی، علمی اور فنی مضامین کے ترجمے کے لیے اردو میں اصطلاحیں وضع کی جائیں قومی اردو کونسل نے دیگر مضامین کی طرح لسانیات کی کتابوں کے ترجمے کے لیے بھی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اصطلاح سازی کے لیے جو اصول مرتب کیے وہ درج ذیل ہیں:

1. ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دینا چاہیے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہوں۔ چاہے ان میں کوئی لسانی یا معنوی سقم ہی کیوں نہ ہو۔
2. اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہے تو ایسی صورت میں اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ الفاظ/اصطلاحات سے واضح کیا جانا چاہیے۔
3. اصطلاحوں اور عام الفاظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عام الفاظ کو (اصطلاحات کی) فرہنگ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔
4. کون سا لفظ اصطلاح ہے اور کون سا محض ایک عام لفظ، اس کا فیصلہ مضمون کے ماہرین کی رائے اور حسب ضرورت معیاری انگریزی لغات کی مدد سے کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسی لغت یا لغات میں کسی لفظ کے کوئی خاص معنی یہ کہہ کر دیے گئے ہیں کہ یہ معنی کسی فن یا کسی علم سے مخصوص ہیں تو اس فن یا علم کے مقاصد کے لیے اس لفظ کو اصطلاح تصور کیا جائے۔
5. جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ اصول نمبر 2 کی ذیل میں نہ آتا ہو۔
6. جہاں تک ممکن ہو سکے، اصطلاح ایک لفظی ہی ہونی چاہیے۔ ناگزیر

صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اصطلاحیں کم سے کم وضع کی جائیں جو دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوں۔

7. ہندی اصطلاح کے اختیار کرنے کو (اگر ایسی اصطلاحیں اردو میں بآسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکتی ہوں) عربی اصطلاحوں کے اختیار کرنے پر مرجح سمجھا جائے۔

8. اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زائد الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حسب ذیل ترکیبات کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے ترجیح دی جائے گی۔

ا. وہ ترکیبات جن میں اضافت یا حروف ربط و جار کی قسم کے الفاظ و علامات نہ ہوں۔

ب. وہ ترکیبات جن میں یائے نسبتی ہو۔

ج. وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو (بشرطیکہ ان میں ایک سے زائد اضافتیں ہوں تو ان میں کم سے کم ایک کو کا، کی، کے سے بدل دیا جائے)۔

د. وہ ترکیبات جن میں کا، کی، کے وغیرہ استعمال کیے گئے ہوں۔

9. اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد علم یا فن میں مشترک ہے اور ان سب علوم وفنون میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔

10. الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی، عربی، فارسی یا عربی فارسی یا فارسی عربی اور پراکرت ترکیبات بھی قابل قبول ٹھہریں۔

11. اگر کوئی انگریزی اصطلاح مروج ہو اور عام فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے۔ ایسی عام فہم اصلاحوں کے لیے اردو متبادلات بنانے یا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

12. اعلام کو ایسا ہی لکھا جائے جیسے کہ وہ اردو میں مقبول ہو چکے ہیں۔ البتہ ایسے اعلام جو ابھی مقبول نہیں ہوئے ہیں، ان کو حروف تہجی کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ممکن صحت کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔

13. اگر کوئی علم کسی اصطلاح کا حصہ بن چکا ہے تو اس علم کا اصول نمبر 12 کی روشنی میں اردو میں ترجمہ کیا جانا چاہیے۔

کسی زبان کے مواد کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کا اپنا تہذیبی پس منظر اور مزاج ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کا بحسن وخوبی ترجمہ اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب مترجم نہ صرف دونوں زبانوں کی لغات پر قدرت رکھتا ہو بلکہ ان کے مزاج اور ماخذ سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو اور ترجمہ کرتے وقت اصل متن کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں اس کے مزاج اور آہنگ کے مطابق اس طرح سمو کر ایسے پیرایۂ بیان میں منتقل کرے کہ نہ زبان کی سلاست وروانی میں فرق آئے اور نہ موضوع ومفہوم کے بیان میں کہیں ابہام کا شبہ ہو۔ بعض ترجموں کے دوران ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اصل تصنیف کی زبان کا تہذیبی پس منظر ترجمے کی زبان کے تہذیبی پس منظر سے بالکل مختلف ہو اور مصنف کا مدعا فوت ہو جائے تو مترجم کی تمام کوششوں کے باوجود اگر ترجمے میں مغائرت کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اسے جائز سمجھنا چاہیے۔

مترجم کو چاہیے کہ زبان و ادب، فلسفہ، نفسیات، سماجیات، تاریخ، سیاسیات، جغرافیہ، سائنس، مذہبیات اور اقتصادیات جیسے مضامین سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واقفیت رکھنا صحافی مترجم کے لیے تو اشد ضروری ہے۔

مترادفات کا انتخاب موزوں ترین ہونا چاہیے۔ اچھا مترجم وہی ہے جو موقع ومحل کی مناسبت سے موزوں ترین الفاظ کا انتخاب کرے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ ہوں۔ مترجم اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح میں اور محاورے کا ترجمہ محاورے میں کرے تو بہتر ہوگا۔

مختصراً ترجمے کے اصول درج ذیل طے پاتے ہیں:

1. ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی اردو لفظ استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ خود اسے انگریزی لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔ مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنس کے لیے اردو میں ہم کہیں اس کا ترجمہ دفاع کریں، کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت وغیرہ تو غلط ہوگا۔

2. کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم کو چاہیے کہ وہ پہلے پوری کتاب کا باقاعدہ مطالعہ کرے اور اصطلاحوں اور مشکل الفاظ کو نشان زد کرنے کے بعد ان کی فہرست تیار کر لے۔ ان کے لیے موزوں ترجمے تجویز کرے اور ہر جگہ وہی اصطلاح اختیار کرے۔ مناسب ہوگا اگر کتاب کے آخر میں فہرست دینے کا اہتمام کرے۔

3. جہاں تک ممکن ہو کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل اس قسم کا لفظ منتخب کرنا چاہیے جس سے اس کے مشتقات وضع ہو سکیں۔ مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظامیہ ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم انتظام، تنظیم، تنظیمی، منتظم، انتظامی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ بات درست نہ ہوگی کہ انگریزی کے لفظ کا ترجمہ کچھ ہو، اور اس کے مشتقات کا کچھ اور جو اصل لفظ سے مشتق نہ کیا گیا ہو۔

4. انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو، نہ کہ تشریح کی۔ وحیدالدین سلیم کے بقول ''اصطلاح ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے جو

بڑے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے بچاتی ہے۔''

5. بہت سے انگریزی الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ انھیں جوں کا توں رہنے دیا جائے، مثلاً رجسٹری، بل، ڈاک اور ٹکٹ وغیرہ۔
6. بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں آکر بگڑ گئے ہیں لیکن وہ اردو میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انھیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔
7. اگر کوئی انگریزی لفظ یا اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو رہنے دیا جائے مثلاً کمیٹی اور مجلس وغیرہ۔
8. ایسے موزوں مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے جو خاصے مقبول ہو چکے ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی مصنوعی اور بھونڈی اصطلاح وضع کی جائے۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ کا ترجمہ کیا جائے۔
9. جس موضوع کا ترجمہ کرنا مقصود ہو اس سے متعلق کتب وغیرہ کا باقاعدہ مطالعہ کرلیا جائے۔
10. ترجمہ کرتے وقت لفظوں میں پیوست وزن اضافی کے ترجمے کا بھی اہتمام کیا جانا چاہیے۔
11. اگر کسی ادب پارے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے تو اس کے تہذیبی سانچے اور مصنف کے اسلوب کی ترجمانی کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

ترجمے کے تین اہم میدان درج ذیل ہیں:

1. علمی ترجمہ
2. ادبی ترجمہ
3. صحافتی ترجمہ

مذکورہ بالا تینوں قسمیں ترجمے کے تین اہم میدان ہیں جن پر ترجمے کی تینوں تکنیکوں یعنی (1) لفظی ترجمے (2) بامحاورہ یا بین بین ترجمے (3) آزاد ترجمے کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن ایک چیز قابل غور یہ ہے کہ کسی تصنیف یا متن پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ تینوں تکنیکوں کا استعمال کسی بھی فن پارے اور مواد پر ہوتا ہے۔ آپ کو ایک ایک جملے کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کس تکنیک کے استعمال کے ذریعے معیاری ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ مواد کی نوعیت کے پیش نظر کسی ایک تکنیک کا استعمال غالب ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مواد علمی نوعیت کا ہے تو لفظی ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی اور اگر ادبی فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو بامحاورہ یا بین بین ترجمے کا طریقہ غالب ہوگا اور اگر صحافتی نوعیت کا مواد ہے تو آزاد ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی لیکن کسی ایک قسم کے مواد پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال کرنا غلط ہوگا۔

علمی ترجمے کے تحت تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ، تاریخ، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبعیات، سیاسیات اور انجینئرنگ وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ علمی ترجمے عام طور پر لفظی ترجمے کے ذیل میں آتے ہیں۔ علوم وفنون میں مخصوص اور متعین لفظیات اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے اس کا اسی معنی میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ ان ترجموں میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحوں کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ ان اصطلاحوں کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں۔ تمام شرائط کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علمی وفنی کتابوں کا ترجمہ متعلقہ علم وفن کے ماہرین ہی انجام دے۔

ادبی ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بامحاورہ کیا جائے اور ترجمے کی زبان کے روزمرہ، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات وکنایات، تلمیحات اور رموز وعلائم سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ پیدا ہو جائے اور ترجمہ تخلیقی نوعیت اختیار کرلے۔ دراصل ادبیت اور اثر انگیزی مذکورہ صنعتوں میں ہی مضمر ہوتی ہے اور انھی سے ادبا اپنے فن پاروں کو تابدار بناتے ہیں۔ تخلیق کار کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ بامحاورہ اسلوب کے ساتھ ہو جائے۔

صحافتی ترجمے کو کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمے کے ذیل میں آتا ہے۔ مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طریقے سے بیان کر دے۔ اخباری ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت سلیس ہو، تاکہ قارئین کو کسی طرح کی الجھن نہ ہو۔ صحافی مترجمین کو چاہیے کہ جہاں وہ اصل عبارت کو پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں جملوں کو توڑ دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں آیا اصل مطلب ادا ہوا کہ نہیں۔ صحافتی تحریروں کا مقصد صرف عوام کو آگاہ کرنا اور باخبر رکھنا ہوتا ہے اور یہ عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف حکومتِ وقت کے اچھے برے کاموں کے بارے میں، عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف عوام کے حالات، امور اور احساسات کے بارے میں، حکومتِ وقت کو باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے آسان سے آسان زبان و بیان استعمال کرنا صحافت کی سب سے بڑی ضرورت اور خوبی ہے۔

□□□

رابطہ:
Deptt. of Translation
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad (A.P.)

ابن کنول

دانش گاہوں میں تحقیق: سمت و رفتار

دانش گاہوں میں ریسرچ کرنے کے لیے سب سے پہلا مرحلہ طالب علموں کے انتخاب کا آتا ہے۔ میرا خیال ہے موضوع کے انتخاب سے زیادہ اہم کام طالب علم کا انتخاب ہے۔ اساتذہ کو یہ اچھی طرح دیکھ اور پرکھ لینا چاہیے کہ جو طالب علم ریسرچ کرنا چاہتا ہے کیا اس میں تحقیق کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ضروری نہیں کہ اچھے نمبر حاصل کرنے والا طالب علم اچھا ریسرچ اسکالر بھی ثابت ہو، اس لیے طالب علم کے انتخاب میں کافی سختی برتنی چاہیے۔ محض فرسٹ ڈویژن دیکھ کر داخلہ دینا مناسب نہیں اور پھر باصلاحیت طالب علم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پی ایچ ڈی میں داخلے سے قبل اس کی اچھی تربیت کی جائے اسے تحقیق کے اصولوں سے واقف کرایا جائے۔ اس کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں ایک یا ڈیڑھ سال کا ایم فل کا کورس موجود ہے جس میں نہ صرف تحقیق کے طریقۂ کار سے واقف کرایا جاتا ہے بلکہ کم وقت میں ایک مختصر مقالہ یا Dissertation بھی لکھوایا جاتا ہے۔ ایم فل کرنے کے بعد طالب علم کی کافی حد تک تحقیقی کام کرنے کی تربیت ہو جاتی ہے۔ طالب علم کے انتخاب کے بعد موضوع کا تعین دوسرا اہم مرحلہ ہے۔ آج کل طلبہ کو دیے جانے والے بیشتر موضوعات تحقیقی کم تنقیدی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تحقیق اور تحقیق کے ساتھ وابستہ تدوین انتہائی دل سوزی کا عمل ہے۔ دل لگا کر اور دل جلا کر جو طالب علم کام کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، وہی اس جانب رخ کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس تنقیدی مطالعہ قدرے آسان ہو جاتا ہے، بہرحال تنقیدی مطالعہ میں بھی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ نئے حقائق و نتائج کو پیش کرنے کی سعی کرے، موضوع کے انتخاب میں اول تو یہ کوشش کہ موضوع زبان و ادب کے لیے کس قدر اہم ہے یعنی اس کی افادیت کیا ہے؟ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جو موضوع منتخب کیا جارہا ہے کیا وہ اس لائق ہے کہ جسے ڈاکٹریٹ جیسی باوقار سند حاصل کرنے کے لیے پیش کیا جاسکے، ہوتا یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے اسکالر ایسا موضوع تلاش کرتے ہیں جس پر وافر مقدار میں مواد موجود ہو اور پھر اسکالر کا کام محض کٹنگ پیسٹنگ کا رہ جاتا ہے اور نگراں حضرات اسکالر کی نجی خدمات کے پیش نظر ممتحن سے ذاتی مراسم کی بنیاد پر ڈگری دینے کی سفارش بھی کرا لیتے ہیں، ظاہر ہے اس طرح کے تحقیقی مقالات کا معیار اور کیا ہوگا۔ اس لیے حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ موضوع نیا اور اچھوتا ہو اور اگر پرانا بھی ہو تو اس میں نیا کہنے کے لیے کچھ موجود ہو۔ ہماری جامعات میں اساتذہ طلبہ کی دلچسپی جانے بغیر انھیں اپنی دلچسپی یا پسند کا موضوع دے دیتے ہیں ایسی صورت میں اسکالر کو موضوع کو سمجھنے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے بہتر ہو کہ طالب علم کی دلچسپی کے مطابق اسے موضوع دیا جائے۔ طالب علم اگر فارسی کی شد بد رکھتا ہو تو اسے بلا جھجک کلاسیکی اردو کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرنے کی طرف راغب کرایا جائے اور اگر تنقیدی بصیرت کا حامل ہو تو تنقیدی موضوعات تفویض کیے جائیں۔ موضوع کوئی بھی ہو، انتخاب کے وقت چند نکات کا لحاظ رکھیں:

1. موضوع کی افادیت
2. منتخب موضوع پر کیا پہلے کبھی کام ہوا ہے اور ہوا ہے تو کس نوعیت کا؟
3. کیا مقررہ مدت میں اسکالر کام کو مکمل کرسکتا ہے؟
4. کیا بآسانی تحقیقی مواد فراہم ہوسکتا ہے؟

موضوع کی افادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر کام کیا جائے گا تو تحقیقی مقالہ محض سندی تحقیق بن کر لائبریری میں گم نہیں ہوگا بلکہ ہر عہد میں سند کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ منتخب موضوع پر یہ جاننا کہ پہلے بھی اس موضوع پر مقالہ لکھا گیا ہے یا نہیں اس لیے لازمی ہے کہ اس سے تکرار کا اندیشہ کم رہتا ہے ایک ہی موضوع پر کئی مقالے مختلف نظریات اور زاویوں سے لکھے جاسکتے ہیں کوئی بھی کام حرف آخر نہیں ہوتا ہے اس لیے اسکالر سے دہرانے کے بجائے اضافے کی امید کرنی چاہیے۔ موضوع کے تعین کے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسکالر اس کام کو دو تین سال میں مکمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ایسا نہ ہو کہ اس کی عمر عزیز مواد کی فراہمی ہی میں گزر جائے۔ تحقیقی مقالے کے لیے ایسا موضوع بھی نہیں ہونا چاہیے جس پر مواد ہی ملنا مشکل ہو اور اسکالر گھبرا کر راہ فرار اختیار کرے۔

ہماری دانش گاہوں میں ایک بات یہ بھی عام ہوگئی ہے کہ زندہ ادیبوں اور شاعروں پر تحقیقی مقالے لکھوائے جارہے ہیں، ان میں ایسے ادیب اور شاعر

بھی شامل ہیں، جنھوں نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے محض ایک آدھ کتاب ان کے نامۂ اعمال میں ہے لیکن یونیورسٹی کے اساتذہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے انھیں موضوعِ تحقیق بنا دیتے ہیں اس میں استاد اور شاگرد دونوں ہی کا بھلا ہوتا ہے، دونوں کو کچھ نہیں کرنا، ''زیرِ تحقیق'' شخصیت سب کر دیتی ہے۔ دانشگاہوں کی ریسرچ کمیٹی کو ایسے زندہ ادیبوں پر تحقیقی مقالے لکھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے جنھیں ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا بھی غیر مناسب ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مختلف اثرات کے تحت حقائق کا صحیح طور پر علم نہیں ہو پائے گا۔ ذاتی اثرات، غیر معتبر روایتیں، گروہ بندی اور مذہبی یا سیاسی وابستگیوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعی عقیدت، یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلایا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے آدمی جب تک زندہ رہے گا اس کا امکان ہے کہ وہ فکر و عمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے اور ایسی تبدیلیوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اسی لیے زندہ آدمی کے اعمال و افکار کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں۔ مکمل تجزیے کے بغیر کسی شخص کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا، زندہ آدمی کی شخصیت نقاب پوش رہتی ہے اب تک یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا تو اس انتخاب میں دنیاداری کی کسی مصلحت کو ضرور دخل تھا۔''

دانش گاہوں میں ہونے والی تحقیق کا معیار اسی وقت بلند ہو سکتا ہے جب داخلوں اور موضوعات کے انتخابی ضوابط میں سختی برتی جائے۔ ہر سال اردو میں تحقیق کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اضافہ ہونا نیک فال ہے لیکن قابلِ افتخار اس وقت ہوگا ہے جب لائق اور سنجیدہ اسکالر تحقیقی مقالات قلم بند کریں گے۔ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ میں ایسا ذوق پیدا کریں کہ تحقیق ان کے مزاج کا حصہ بن جائے اور صرف سند حاصل کرنے کے لیے مقالہ نہ لکھیں۔

گذشتہ پچاس سالوں میں جامعات ہند میں جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں ان کی موضوعات کے اعتبار سے اگر درجہ بندی کی جائے تو شخصیات پر سب سے زیادہ مقالات نظر آتے ہیں دواوین کی تدوین کا کام بھی تقریباً سبھی یونیورسٹیوں میں ہوا ہے، ان کے علاوہ جن موضوعات پر تحقیقی مقالے قلمبند ہوئے ہیں ان میں تنقیدی مطالعے اور تجزیے، شعری نظریات و تصورات، ادبی و لسانی اور تہذیبی جائزے، مختلف اصناف کی ارتقائی تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔

شخصیات پر کام کرنا مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ مشکل اس طرح کہ اگر شخصیت ماضی بعید کی ہے تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں خاصی دشواری پیدا ہوتی ہے، اس کے برعکس ماضی قریب یا حال کی شخصیات پر کام کرنا آسان ہوتا ہے نہ صرف حالات زندگی بآسانی معلوم ہو جاتے ہیں بلکہ تصانیف بھی دستیاب ہو جاتی ہیں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جن اہم شخصیتوں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1.	مومن دہلوی کی حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ	ظہیر احمد صدیقی
2.	مرزا مظہر جان جاناں	خلیق انجم
3.	بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری	اسلم پرویز
4.	مصحفی کی حیات اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ	نور الحسن نقوی
5.	اسمٰعیل میرٹھی	سیفی پریمی
6.	شیفتہ: حیات اور کارنامے	صلاح الدین خاں
7.	عبدالحلیم شرر: حیات اور کارنامے	شریف احمد
8.	محمد علی طبیب: حیات اور کارنامے	عبدالحئی
9.	میر امن دہلوی کی حیات اور کارنامے	نفیس جہاں بیگم
10.	میر مہدی مجروح کی حیات اور خدمات	محمد فیروز
11.	حجاب امتیاز علی: حیات اور خدمات	مجیب احمد خاں
12.	ملا وجہی	جاوید وششٹ
13.	خواجہ حسن نظامی: حیات اور خدمات	نسرین سلطان
14.	ناصر نذیر فراق اور ادبی خدمات	فیضان حسن
15.	اختر الایمان: شخصیت اور خدمات	نوشاد عالم

مذکورہ شخصیات اردو ادب کا اہم حصہ ہیں ان میں سے تقریباً سبھی مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں پچھلے تیس سالوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جن اہم شخصیات پر تحقیقی مقالے قلمبند کیے گئے وہ اس طرح ہیں:

1.	ذوق: سوانح اور انتقاد	تنویر احمد علوی
2.	ابوالکلام آزاد	رضی الدین
3.	پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ	قمر رئیس
4.	رشید احمد صدیقی: حیات اور فن	رونق جہاں زیدی
5.	عبدالرحمن بجنوری: حیات اور ادبی کارنامے	محمد زاہد
6.	دیا شنکر نسیم: حیات اور شاعری	مسعود اختر
7.	سید سلیمان ندوی: حیات اور ادبی کارنامے	سید محمد ہاشم
8.	سجاد حسین: حیات اور کارنامے	عائشہ بیگم
9.	راشد الخیری کے ادبی کارناموں کا تنقیدی مطالعہ	منور سلطانہ

.10	میر محفوظ علی	رعنا رکن الدین
.11	خواجہ حسن نظامی حیات اور ادبی خدمات	امام مرتضیٰ نقوی
.12	فراق شخصیت اور شاعری	تسکینہ فاضل

گورکھپور یونیورسٹی میں ادبی شخصیات پر جو تحقیقی مقالے لکھے گئے، وہ حسب ذیل ہیں:

.13	فراق شخص و شاعر	افغان اللہ خاں گورکھپور یونیورسٹی
.14	حسرت موہانی	احمد لاری گورکھپور یونیورسٹی

کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں جن قابل ذکر شخصیات پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ان میں حسب ذیل نام شامل ہیں:

.1	منٹو: حیات اور کارنامے	برج پریمی
.2	مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے	محمد زماں آزردہ
.3	عصمت چغتائی: شخصیت اور فن	دل افروز گنجو
.4	شاہ حاتم: حیات اور شاعری	غلام نبی بٹ
.5	سردار جعفری: شخصیت اور فن	کوثر پروین
.6	اکبر حیدری: حیات اور کارنامے	محمد جعفر
.7	ماہر القادری کی ادبی خدمات	عبدالحمید گنائی
.8	پروفیسر محمد امین اندرابی حیات اور کارنامے	فاروق احمد راتھر

دکن میں ممبئی یونیورسٹی، حیدرآباد اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی تحقیق کا کام شمالی ہند کی طرز پر ہی جاری ہے، ممبئی یونیورسٹی میں حسب ذیل شخصیات پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں:

.1	مولانا محمد حسین آزاد: حیات اور کارنامے	عبدالستار دلوی
.2	مرزا رسوا: حیات اور ناول نگاری	آدم شیخ
.3	نظیر اکبرآبادی: حیات اور شاعری	ضمیر الدین خاں
.4	آرزو لکھنوی: حیات اور کارنامے	سید مجاہد حسین حسینی
.5	نوح ناروی: حیات اور کارنامے	ظفر الاسلام ظفر
.6	مولانا محمد علی جوہر: سیاسی فکر و عمل	سید شبیر علی
.7	عبدالماجد دریابادی: حیات اور کارنامے	طاہرہ محمد حلیم
.8	عندلیب شادانی: حیات اور کارنامے	کلثوم ابوالبشر
.9	سید سلیمان ندوی: حیات اور کارنامے	شیخ عبداللہ
.10	کرشن چندر بحیثیت طنز و مزاح نگار	عقیل احمد شیخ

اسی طرح لکھنؤ، الہ آباد، پٹنہ اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں معروف اور غیر معروف، مستحق اور غیر مستحق شخصیات پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں ہندوستان میں کیونکہ کثیر تعداد میں تحقیقی مقالے قلمبند ہوتے ہیں اس لیے ایسی زندہ شخصیات کو بھی تعلقات کی بنا پر موضوع تحقیق بننے کا اعزاز نصیب ہو جاتا ہے، جنھیں شاید پس از مرگ کوئی یاد بھی نہ کرے۔ اسی لیے بعض دانشگاہوں نے زندہ شخصیات کے تعلق سے حیات اور خدمات پر تحقیقی مقالے لکھنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے اس میں دہلی یونیورسٹی خاص طور سے شامل ہے۔ شخصیات کے بعد دوسرا اہم موضوع تنقیدی مطالعے یا تجزیے کا ہے، یہ شخصیات پر کام کرنے کے لیے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والا معاملہ ہے، کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ یا تجزیہ پیش کرنے سے قبل اسکالر ایک باب میں شاعر یا ادیب کی سوانح بیان کرتا ہے اور موضوع وہی بن جاتا ہے جو حیات اور خدمات کا ہے اس طرح کے تحقیقی مقالوں کے بعض موضوع حسب ذیل ہیں، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے عنوانات ہیں:

.1	جرأت کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	مجیب الرحمٰن قریشی
.2	جوش ملیح آبادی کی امیجری کا تنقیدی مطالعہ	نسرین رئیس خاں
.3	فکر اقبال کا تنقیدی مطالعہ	شمیم احمد
.4	اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	محمد محسن
.5	راجندر سنگھ بیدی کے فن کا تنقیدی مطالعہ	پرویز احمد
.6	عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ	خدیجہ خاتون

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اس طرح کے تحقیقی مقالے درج ذیل عنوانات سے لکھے گئے ہیں:

.1	میر سوز کی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	نجمہ رضوی
.2	قائم کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	شمیم زہرا
.3	میر درد کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	شہناز بانو
.4	مصحفی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سعید الدین مینائی
.5	اردو کی خواتین ناول نگاروں کا تنقیدی مطالعہ	شہناز مرزا

ملک کی دوسری دانشگاہوں کے عنوانات بھی مذکورہ عنوانات سے مختلف نہیں میرا مقصد فہرست سازی نہیں اور نہ یہ ممکن ہے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف دانشگاہوں میں سندی تحقیق کی سمت و رفتار کیا ہے کس طرح کے مقالے قلمبند کیے جا رہے ہیں بعض دانشگاہوں میں تحقیق و تدوین اور فرہنگ سازی کا کام بھی ہوا ہے مثلاً دہلی یونیورسٹی کے کچھ موضوعات اس طرح ہیں:

.1	دیوان میر اثر کی تدوین	فضل حق قریشی
.2	کلام ممنون کی تحقیق اور تنقیدی تدوین	افسری الفخار

3.	کلام یقین کی تحقیق اور تنقیدی تدوین	فرحت فاطمہ	
4.	مکاتیب اقبال کی تدوین وتجزیہ	شبیر حسین خاں	

ان کے علاوہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے رشید حسن خاں مرحوم کی مدد سے تحقیق وتدوین کا کافی کام کیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدوین کے ساتھ ساتھ فرہنگ سازی پر بھی توجہ دی گئی ہے مثلاً:

1.	نظیر اکبرآبادی کے کلام کی فرہنگ	نعیم فاطمہ جعفری
2.	طلسم ہوشربا کی فرہنگ	نگہت سلطانہ
3.	شمالی ہند کے اردو قصائد کی فرہنگ	اُم ہانی اشرف
4.	فرہنگ انیس ودبیر	نسرین ہاشمی
5.	فرہنگ غالب	نجمہ شمشاد
6.	فرہنگ اقبال	امتیاز احمد
7.	شمالی ہند کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی مثنویوں کی فرہنگ	ضیاالدین انصاری

یہاں میر کے تمام دواوین کے علاوہ ناسخ، قدرت اللہ قاسم، کریم الدین، نواب یوسف علی خاں ناظم، مرزا محمد تقی خاں ترقی کے کلام کی تدوین بھی عمل میں آئی۔ کشمیر یونیورسٹی میں اس طرح کا کوئی تحقیقی کام میرے علم میں نہیں ہے البتہ دوسری یونیورسٹیوں میں تدوین اور فرہنگ سازی کے تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ اصناف کے تحقیقی وتنقیدی اور ارتقائی جائزے پر تقریباً سبھی دانشگاہوں میں کام ہوا ہے، اس طرح کے تحقیقی مقالے تاریخ ادب کے مطالعہ کے لیے خاصے کارآمد ثابت ہوتے ہیں، کچھ مقالوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

1.	مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی ارتقا	خواجہ احمد فاروقی	دہلی یونیورسٹی
2.	اردو ناول کا آغاز وارتقا 1857 سے 1914 تک	عظیم الشان صدیقی	دہلی یونیورسٹی
3.	اردو میں شہرآشوب	نعیم احمد	دہلی یونیورسٹی
4.	اردو نثر کا ارتقا 1800 سے 1857 تک	عابدہ بیگم	دہلی یونیورسٹی
5.	اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا 1914 سے 1945 تک	ممتاز فاخرہ	دہلی یونیورسٹی
6.	اردو ڈرامہ نگاروں کا تذکرہ	مظہرالحق	دہلی یونیورسٹی
7.	اردو مختصر افسانہ 1947 تا حال	نگہت ریحانہ خان	دہلی یونیورسٹی
8.	اردو میں رپورتاژ کا تنقیدی مطالعہ	طلعت گل	دہلی یونیورسٹی
9.	اردو افسانے کا ارتقا پریم چند تا حال	جمال آرا نظامی	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
10.	اردو نظم کا مطالعہ 1936 تا حال	عقیل احمد	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
11.	اردو ہجویات کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ	ضرغام حیدر	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
12.	اردو غزل: جدید سے مابعد جدیدیت تک	شبینہ پروین	کشمیر یونیورسٹی
13.	اردو تنقید: 1960 کے بعد	غلام نبی مومن	ممبئی یونیورسٹی
14.	اردو نظم: 1960 کے بعد	محمد قاسم امام الدین	ممبئی یونیورسٹی

شاعری اور نثری اصناف میں مختلف نظریات، تصورات اور تہذیبی وسماجی عناصر کی تلاش بھی تحقیق کا خاص موضوع رہا ہے۔ مثلاً:

1.	اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر	گوپی چند نارنگ	دہلی یونیورسٹی
2.	اردو شاعری میں قومیت کا تصور	مغیث الدین فریدی	دہلی یونیورسٹی
3.	بوستان خیال کا تہذیبی اور لسانی مطالعہ	ناصر محمود کمال	دہلی یونیورسٹی
4.	اردو افسانہ کا سماجی مطالعہ	عائشہ سلطانہ	دہلی یونیورسٹی
5.	اردو غزل کا علامتی، سماجی اور تہذیبی پس منظر	سراج الدین اجملی	دہلی یونیورسٹی
6.	اردو غزل کے تہذیبی تناظر	طاہرہ منظور	دہلی یونیورسٹی
7.	اردو ناول میں حقیقت نگاری	سرفراز اختر	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
8.	اردو غزل میں جدید میلانات	منظور ہاشمی	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
9.	اردو نظم پر یوروپی اثرات	حامدی کاشمیری	کشمیر یونیورسٹی
10.	اردو افسانے میں تہذیبی عناصر	منصور احمد میر	کشمیر یونیورسٹی
11.	اردو افسانے میں سماجی شعور	شفیقہ خان	کشمیر یونیورسٹی
12.	اردو ناول میں المیہ عناصر	محرم اشرف	کشمیر یونیورسٹی
13.	اردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر	عبدالقیوم ختائی	کشمیر یونیورسٹی
14.	اردو تنقید پر سماجی وتہذیبی اثرات	غلام محمد وانی	کشمیر یونیورسٹی
15.	اردو انشائیہ میں سماجی طنز	بشیر احمد	کشمیر یونیورسٹی
16.	اردو شاعری میں عشق کا تصور اور اس کی روایت	سید محمد حسن	ممبئی یونیورسٹی
17.	اردو شاعری میں شیعی اثرات	رفیعہ شبنم عابدی	ممبئی یونیورسٹی

18.	اردو شاعری میں معاشیات واقتصادیات	قاضی مغیث الدین	ممبئی یونیورسٹی
19.	اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات	عطاء الرحمن صدیقی	ممبئی یونیورسٹی
20.	اردو افسانے میں مشترکہ تہذیب کے عناصر	احمد طارق	الہ آباد یونیورسٹی
21.	اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ	صالحہ زریں	الہ آباد یونیورسٹی
22.	اردو ناول میں خاندانی زندگی	فخرالکریم	الہ آباد یونیورسٹی

تحقیقی مقالوں کے موضوعات کو علاقائیت کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا گیا ہے یعنی جس صوبے سے اسکالر کا تعلق ہے اس نے وہاں کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کرکے تاریخی وتحقیقی کام کیا ہے۔ مثلاً:

1.	میسور اسٹیٹ میں اردو کی نشوونما	حبیب النساء بیگم	دہلی یونیورسٹی
2.	دلّی میں اردو افسانہ 1900 تا 1947	عظمیٰ ہما	دہلی یونیورسٹی
3.	جونپور کی ادبی خدمات	خدیجہ طاہرہ	دہلی یونیورسٹی
4.	اردو کی ادبی نثر اور دہلی کے نثر نگار	رئیسہ بانو خاں	دہلی یونیورسٹی
5.	دہلی میں اردو ادب کے طنز و مزاح کا ارتقاء	اختر سلطانہ	دہلی یونیورسٹی
6.	دہلی میں رومانوی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ	محمد یحییٰ	دہلی یونیورسٹی
7.	اردو افسانے کے فروغ میں علی گڑھ کا حصہ	فرح جاوید	دہلی یونیورسٹی
8.	اردو نظم دبستان لکھنؤ میں	منہاج اختر خاں	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
9.	شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی	حسن احمد نظامی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
10.	اردو اور کشمیری شاعری میں رومانیت	محبوبہ وانی	کشمیر یونیورسٹی
11.	اردو اور کشمیری شاعری میں ترقی پسند رجحانات	محمد رمضان بٹ	کشمیر یونیورسٹی
12.	کشمیری غزل پر اردو غزل کے اثرات	غلام محمد بڈھ	کشمیر یونیورسٹی
13.	کشمیری اور اردو مرثیہ میں ڈرامائی عناصر	نرگس بانو	کشمیر یونیورسٹی
14.	بمبئی میں اردو	میمونہ عبدالستار دلوی	ممبئی یونیورسٹی
15.	بیجاپور کی اردو مثنویاں	شیخ عبدالقیوم صادق	ممبئی یونیورسٹی
16.	مہاراشٹر کی اردو مثنویوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سعیدہ اختر پٹیل	ممبئی یونیورسٹی
17.	اردو شعر وادب کے فروغ میں ریاست رامپور کا حصہ	محمد الیاس	جامعہ ملیہ اسلامیہ

اسی طرح کے بہت سے موضوعات پر تحقیقی مقالے مختلف صوبوں کی دانشگاہوں میں لکھے گئے ہیں اس طرح کے تحقیقی کام کا یہ فائدہ بھی ہے کہ جن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر تاریخ ادب اردو میں نہیں آپاتا وہ ان مقالوں کا حصہ بن کر تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ نمائندہ ادبی وتعلیمی اداروں پر بھی ملک کی مختلف دانشگاہوں میں تحقیقی مقالے قلمبند ہوئے ہیں۔ مثلاً:

1.	اردو کے ارتقا میں دارالمصنفین کا حصہ	عطاء اللہ خاور ہاشمی	دہلی یونیورسٹی
2.	دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات	مجیب الاسلام	دہلی یونیورسٹی
3.	فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانوں کا تہذیبی مطالعہ	عفت زریں	دہلی یونیورسٹی
4.	اردو کی ادبی نثر کے ارتقا میں جامعہ کا حصہ	مہدی حسن	جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
5.	جموں وکشمیر اکادمی کی ادبی خدمات	عبدالحمید بٹ	کشمیر یونیورسٹی
6.	اردو زبان کی ترویج وترقی میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کا حصہ	مشتاق احمد	کشمیر یونیورسٹی
7.	اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں ساہتیہ اکادمی کا حصہ	نصرت جان	کشمیر یونیورسٹی

ان کے علاوہ بھی دیگر اداروں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔

ہندوستان کے بیشتر صوبوں کی دانشگاہوں میں متعدد تحقیقی مقالے مختلف موضوعات پر لکھے جارہے ہیں جن کی فہرست تیار کرنا خاصا دشوار کام ہے، لیکن تحقیق کی صورتحال دیکھتے ہوئے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دانشگاہوں میں تحقیق کی رفتار مایوس کن نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ زیادتی کے سبب معیار

National Council for Promotion of Urdu Language ★ New Delhi ★
ACC No.

رابطہ:
Department of Urdu
Delhi University
Delhi-110007

شمس بدایونی

عالمی خبرنویسی کا ایک طرز خاص

(اخبار 'سچ' کے حوالے سے)

اردو صحافت کی ابتدا مارچ 1822 سے ہوئی، جب فارسی اخبار ''جام جہاں نما'' کلکتہ کا آٹھواں شمارہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مشترک شائع ہوا۔ اخبار 'سچ' کا پہلا شمارہ 2 جنوری 1920 کو سید الحق علی علوی معروف بہ ظفر الملک (1946-1884) کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ ان دونوں اخبارات کی درمیانی مدت میں جو تقریباً 103 سال پر محیط ہے، اردو اخبارات و رسائل کثرت سے شائع ہوئے جن کی تفصیل کتب صحافت میں محفوظ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری دہوں تک اردو اخبارات میں عالمی خبریں خال خال ہوتی تھیں اور اگر خبریں دی بھی جاتی تھیں تو ان کے لیے کوئی علاحدہ کالم یا صفحہ مخصوص نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے غیر ملکی خبریں ہندوستانی اخباروں میں بھی جگہ پانے لگیں اور ان کو ہندوستان سے باہر کی خبریں، غیر ملکی خبریں یا حدیث دیگراں وغیرہ عنوانات کے تحت پیش کیا جانے لگا۔ اس وقت عالمی خبروں کے ضمن میں زیادہ تر جنگوں کے حالات، واقعات و حادثات، نادر الوجود کہانیاں اور سائنسی دریافتیں وغیرہ شامل تھیں۔ سیاسی جدوجہد کی وجہ سے حکومت برطانیہ کے رہنماؤں کے بیانات بھی شائع ہوتے تھے۔ ان خبروں کو بالخصوص شائع کیا جاتا تھا جن کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ اور جن کی اشاعت سے حکومت وقت کی کارگزاریوں اور بالادستی کا اظہار ہوتا تھا۔

اخبار ''سچ'' نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اور ان خبروں کو اس نے مشرقی اقدار و روایات کے آئینے میں دیکھنے اور پیش کرنے کا ایک ایسا انداز اختیار کیا جس میں مغرب و مشرق کی فکری کشمکش اور اس پر قابو پانے کی امکان بھر کوشش صاف طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

''سچ'' ایک ہفتہ وار اصلاحی اخبار تھا جو 8 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس اخبار کا ہدف دعوتِ اسلام، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات بنانا، اصلاحِ رسوم و معاشرت، حصولِ آزادی کی جدوجہد، مغربی تہذیب پر یلغار اور مشرقی اقدار کی پاسداری تھا۔ سچ کے مالک، ناشر و طابع ظفر الملک ہی تھے۔ جو ماہنامہ 'الناظر' لکھنؤ کے مدیر اور الناظر پریس لکھنؤ کے مالک بھی تھے۔ اس اصلاحی اخبار کا ایک صفحہ خبروں کے لیے مخصوص تھا جس کو ''دنیا میں کیا ہو رہا ہے'' عنوان دیا گیا تھا۔ اس عنوان کو دو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے اندر، ہندوستان کے باہر۔ خبروں کے اس صفحہ کا آغاز 9 جنوری 1920 کی اشاعت سے ہوا۔ وسط 1920 میں اسے موقوف کر دیا گیا۔ 1927 میں اس کالم کو پھر سے اخبار میں جگہ دے دی گئی۔

غیر ملکی خبروں کا تعلق صرف مسلم ممالک سے تھا۔ عالم اسلام میں اس وقت مغربی ممالک کی ریشہ دوانیاں شباب پر تھیں۔ جنگ عظیم اول (1914-1919) کے اثرات مابعد کے تحت اکثر ممالک انقلاب یا تقسیم کے عمل سے دوچار تھے۔ ان میں مصر ترکی، عراق، ایران، افغانستان، نجد و حجاز، فلسطین وغیرہ میں سیاسی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ 1920 میں شریفی و سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اس سرزمین مقدس سے مذہبی و جذباتی وابستگی کے سبب سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ سچ کے اس کالم میں نجد و حجاز کی خبروں کو نمایاں طور پر جگہ دی گئی۔ اس آویزش پر بعض مضامین بھی شائع کیے گئے۔ سچ کے اس کالم سے چند مختصر خبریں مثال میں درج کی جا رہی ہیں:

ایران: سردار سپاہ آقا رضا خاں کے اختیارات میں وسعت ہو جانے سے امید کی جاتی ہے کہ ملک کے حالات میں بہت کچھ اصلاح ہو سکے گی لیکن برطانوی مدبرین کو خطرہ ہے کہ اس سے برطانیہ عظمیٰ کے مفاد کو صدمہ پہنچے گا۔ شاہ ایران سے درخواست کی گئی ہے کہ للہ اب سیاحت ختم فرمایئے۔ سردار سپاہ نے اعلان کیا ہے کہ اگر اس درخواست پر توجہ نہ کی گئی تو پھر بالکل آخری درخواست کی جائے گی۔ اربابِ سیاست حالات کی موجودہ رفتار کو امید افزا بتاتے ہیں۔

(سچ۔ 6 مارچ 1920)

فلسطین: لارڈ بالفور (Lord Bal Fore) جو بیت المقدس کو یہودیوں کا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یہودی یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ فلسطین کی مجلسِ عالیہ بائیکاٹ کا پہلے فیصلہ کر چکی تھی۔ چنانچہ ہر جگہ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ فلسطین میں 6 ہزار عربوں نے پُرامن بائیکاٹ سے گزر کر آپ کی مزید مخالفت کرنی چاہی اور جس ہوٹل میں آپ کا قیام تھا اس پر خشت باری شروع کر دی۔ آپ تو

بھاگ کر کمرے میں چھپ رہے، فوج نے گولیوں سے مجمع کو منتشر کیا۔ موقع پاتے ہی آپ موٹر پر بھاگے اور اسکندریہ روانہ ہو گئے۔

(سچ۔17 اپریل 1920)

ترکی: اخبار ٹیلی گراف لندن نے ایک تار شائع کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ موصل کے متعلق ترکوں کی دھمکی روز بہ روز سخت ہوتی جاتی ہے۔ قسطنطنیہ کے لوگوں کا بیان ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی تجویز ہے کہ اگر مجلس اقوام کا فیصلہ موصل کے بارے میں ہمارے خلاف ہوا تو جنگ ضرور سمجھی جائے گی۔

(سچ۔22 مئی 1920)

مصر: جنوبی مصر میں انگریزوں کے خلاف سخت شورش برپا ہے۔ اس علاقہ سے انگریزوں نے اپنی فوجیں ہٹا لینے کا ارادہ کیا ہے تا کہ لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ حکومت مصر نے تمام ملک میں مارشل لا جاری کر کے اخباروں پر احتساب قائم کر دیا ہے۔ زاغلول پاشا نے حال میں ایک وفد کے سامنے اپنے ارادوں کی بابت ایک بیان دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالت پر وہ غور کر رہے ہیں۔

(سچ۔17 جولائی 1920)

سرخیوں سے بے نیاز یہ خبریں صرف ملک و مقام کے نام کو خبر کا عنوان قرار دے کر غیر ملکی حالات و واقعات کو بغیر کسی تبصرے اور جائزے کے پیش کرتی تھیں۔ اگست 1920 میں اردو کے صاحب طرز انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی (1802-1977) 'سچ' کے مدیر قرار پائے اور ترتیب و ادارتی امور تمام تر ان سے متعلق کر دیے گئے۔ البتہ پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے حسب سابق 'مظفر الملک' کے نام کا اندراج اخبار پر ہوتا رہا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادارت میں ''سچ'' کا پہلا شمارہ 7 اگست 1920 کو شائع ہوا۔ مولانا نے اس کی ترتیب و تہذیب میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی۔

مولانا نے 1922 سے سچ میں عالمی خبروں کو ایک خاص انداز میں پیش کرنا شروع کیا۔ بعد میں یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ اردو صحافت میں ایک طرز خاص کہلایا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بی۔اے۔ پاس تھے۔ ان کو انگریزی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی زبردست مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی دانی ہی کی وجہ سے ان کو انگریزی اخبارات سے خبروں کے انتخاب اور ترجمہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ یوں تو وہ جن ہر ملکی و غیر ملکی 'انگریزی' اخبارات ان کے مطالعے میں رہتے تھے لیکن 'سچ' کے لیے عموماً وہ لندن سے شائع ہونے والے اخبارات ڈیلی میل (Daily Mail) نیوز آف دی ورلڈ (News of the World) ڈیلی نیوز (Daily News) جان بل (John Bull) ڈیلی ایکسپریس (Daily Express) ڈیلی ٹیلی گراف (Daily Telegraph) وغیرہ سے ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت خبروں کا انتخاب کرتے پھر ان کو کسی ادبی سرخی کے تحت ایک خاص احتسابی اور طنزیہ انداز میں پیش کرتے۔

مولانا یورپ کے اخبارات و رسائل سے وہاں کے معاشرے میں جرائم کی کثرت، عریانیت، جنسی بے راہ روی، عدل و انصاف، مذہب و روحانیت کے تعلق سے ان کے قول و عمل کے تضاد، قوموں، فرقوں، ملکوں اور جماعتوں کے متعلق ان کی عصبیت اور ملکی اقتدار کی ہوس کو حوالہ و استناد اور اعداد و شمار کے ساتھ اخذ کرتے پھر اس کا تقابل مشرقی افکار و اقدار، عدل و انصاف، مذہب و روایت اور قانون و حکومت سے کرتے اور طنز و تعریض کے ساتھ مغرب کی ذہنی و عملی پستی کو اجاگر کرتے۔ یوں وہ مغرب اور مغرب کے پرستاروں کو ایک آئینہ دکھاتے۔ سطور ذیل میں دو مختصر خبریں درج کی جا رہی ہیں۔

چند سبق آموز اعداد: نیوز آف دی ورلڈ (لندن) پیرس کے پروفیسر گیسٹین کاڈو (Gasiton Cado) کے حوالے سے کشتگان جنگ یورپ کے متعلق ہر ملک کی آبادی کے تناسب سے اعداد ذیل شائع کرتا ہے:

1. امریکہ میں آبادی کا 1/2000 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا۔
2. روس میں آبادی کا 1/107 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا
3. اٹلی میں آبادی کا 1/79 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا
4. برطانیہ میں آبادی کا 1/66 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا
5. آسٹریلیا میں آبادی کا 1/50 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا
6. جرمنی میں آبادی کا 1/35 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا
7. فرانس میں آبادی کا 1/27 حصہ میدان جنگ میں کام آگیا

پروفیسر موصوف ہی کے الفاظ میں اگر فرانس کے کل کشتگان جنگ جن کی تعداد 13,23000 ہوتی ہے بالفرض اپنی قبروں سے نکل آئیں اور چار چار اشخاص کی قطار بنا کر کسی خاص مقام سے فی گھنٹہ ساڑھے دس دس ہزار کی تعداد میں گزرنا شروع کر دیں تو کل تعداد کے گزرنے کے لیے پانچ دن اور پانچ راتیں درکار ہوں گی۔

یہ محاربات صلیبی (کروسیڈس Crusades) کے زمانے کے نیم مہذب نیم بیدار و جنگ جو یورپ کا قصہ نہیں بلکہ بیسویں صدی کے مہذب و شائستہ، آراستہ و بیدار، عالم و فاضل، صلح جو عافیت پسند یورپ کا مرقع ہے۔

(سچ۔19 مارچ 1926)

شاہ جم جاہ بطور ایکٹر کے!

ہمارے جہاں پناہ ملک معظم، جارج پنجم اور بادشاہ بیگم صاحبہ قیصرہ، سینما اور دوسرے تماشوں کے ایکٹروں کی جو سرپرستی اور قدر افزائی فرماتے رہے ہیں اس کے تذکرے ولایتی اخبارات میں برابر ہوتے رہتے ہیں۔ حال میں امریکہ کے اخبار "ایوننگ گرافک" نیو یارک (Evening Graphic) نے 16 جولائی کی اشاعت میں وارث تخت و تاج برطانیہ کے چشم و چراغ، شہزادہ ولی عہد بہادر (پرنس آف ویلز) کی بابت فوٹو دے کر یہ خبر شائع کی ہے کہ لندن کے ایک سینما کے لیے آپ نے بہ نفس نفیس پارٹ کرنا منظور فرمایا اور عام ایکٹروں کی طرح اپنے روئے صاف پر غازہ وغیرہ کا باقاعدہ استعمال فرمایا!

یہ روایت اگر صحیح ہے تو واجد علی شاہ (شاہ اودھ) کا اندر سبھا، ناٹک میں شریک ہونا، تہذیب جدید کی عدالت میں کیا اب بھی کوئی سنگین جرم باقی رہے گا۔

(سچ 2 ستمبر 1927)

'سچ' کے ہر شمارے میں اسی انداز کی کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ خبریں شامل کی جاتی تھیں۔ 1926 سے 1933 تک مسلسل شائع ہونے والی ان خبروں کا اگر انتخاب کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

ان خبروں میں مولانا کا طنز بہت گہرا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان کے لہجے میں نشتریت پیدا ہو جاتی تھی۔ اکبرالہٰ آبادی (ف 1921) کی طرح مغرب اور مغرب پرستی سے ان کا معاملہ انتہا پسندانہ تھا۔

مشرقی نقطۂ نظر سے طنز و مزاح کا آغاز تو "اودھ پنچ" لکھنؤ (اجرا 1877) کے مدیر اور اس کے بعض قلم کاروں اور نامہ نگاروں کے ذریعے ہو چکا تھا لیکن یہ بہت کچھ شخصی تھا اور متانت و سنجیدگی سے معرا تھا۔ مولانا دریابادی نے اول اسے خبر نویسی سے متعلق کیا دوم اسے معمولی قسم کے مزاح سے بچا کر اعلیٰ درجے کے طنز سے قریب تر کر دیا اور اسے متانت و تدبر سے آراستہ کر کے بامقصد ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا۔

مولانا دریابادی کا مزاج فلسفیانہ اور مسلک اقدار مشرق کی پاسداری تھی۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی (ف 1943) کے حلقہ بگوش تھے اور مشرقی اوضاع و روایات کے ضمن میں اسلامی پس منظر کو نظر میں رکھتے تھے۔ ان کا منشا مغربی افکار و نظام حیات کے مقابلے میں مشرقی افکار و نظام حیات (خاص طور پر اسلامی روایات کے حوالے سے) کی برتری کو تسلیم کرانا تھا۔ مثال میں چند خبریں اور درج کی جا رہی ہیں جن کے مطالعے سے میرے مذکورہ خیال کی تصدیق ہو سکے گی۔

اہل ناز کا نیاز:

نیو یارک سے خبر آئی ہے کہ اہل شکاگو مے نوشی، بدمستی اور ہر وقت کی خوں ریزیوں سے تنگ آ کر وہاں کی انجمن کلیسا (چرچ فیڈریشن) نے بالآخر خدا سے دعا مانگنے کی ٹھہرائی۔ چنانچہ ایک لاکھ پروٹسٹنٹ مسیحیوں نے دعا مانگی کہ بدمعاش اور سیاسی خائن غارت ہوں۔

(ڈیلی ٹیلی گراف، لندن 9 مارچ 1928)

یہ دعائیں مانگنا، مسجدوں میں جا جا کر، مصلے پر بیٹھ بیٹھ کر، سجدہ میں گر گر کر، پروردگار کے سامنے گڑگڑانا تو مشرق کی ایک تاریک خیال قوم کا شعار تھا۔ یہ کیا ہوا کہ مہذب قوم کی مہذب آبادی بھی اسی دقیانوسیت میں مبتلا ہو گئی؟ اب تک تو ہم تہی دست و تہی دماغ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ خدا کے قائل وہی ہوتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن "صاحب" کے پاس تو سب کچھ ہے۔ پولیس ہے، خفیہ پولیس ہے، علانیہ پولیس ہے، فوج ہے، خزانہ ہے، توپ خانہ ہے، بم کے گولے ہیں۔ لشکر جرار ہے، موٹریں ہیں، ہوائی جہاز ہیں، ہتکڑیاں ہیں، بیڑیاں ہیں، بڑے بڑے ہیبت ناک پھاٹکوں والے جیل خانے اور بڑے بڑے ہیبت ناک چہروں والے برق انداز ہیں۔ پھانسی گھر ہیں، جلاد ہیں، تفتیش جرائم کے سائنٹفک طریقے ہیں اور ان طریقوں کے ماہرین خصوصی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ماننے کی ضرورت اس سارے سامان کے باوجود بھی پڑ جاتی ہے! اب تک تو اس عقیدے کو ہم ایک توہم اور ڈھکوسلا ہی سمجھتے رہے، پر کیا کیجیے کہ "صاحب" کو بھی کبھی کبھی اس وہم میں گرفتار ہونے کی ضرورت پڑ جاتی ہے!

(سچ۔ 13 اپریل 1928)

بدکاری کا اعزاز:

'ڈیلی ایکسپریس' برطانیہ کے مشہور ترین روزناموں میں ہے۔ ہندوستان کے کسی باکمال کا اس کے کالموں میں مدح و ستائش کے ساتھ ذکر آنا عجائب روزگار میں سے ہے۔ 22 نومبر کے پرچے میں یہ خوش نصیبی ایک ہندوستانی کے حصہ میں آئی ہے اور ہندوستانیوں میں بھی ایک ہندوستانی عورت کے حصے میں! صفحہ 9 پر سطر دو سطر نہیں، ایک کالم کا تقریباً نصف حصہ ان "نیک بخت" کے کمالات کی داد و تحسین اور تصویر کی نذر ہے۔ آپ اشتیاق سے سوال کریں گے کہ آخر یہ خوش نصیب ہندوستانی خاتون ہیں کون؟ جواب میں (کتنوں کو یقین آئے گا کہ) وہ کوئی رانی نہیں، کوئی بیگم نہیں، کوئی شاعرہ نہیں، کوئی مصنفہ نہیں، کسی شریف گھرانے کی شریف بہو بیٹی نہیں بلکہ الہٰ آباد کی ایک مشہور ہندو طوائف ہے۔ جس کے گانے گراموفون میں ریکارڈ کیے ہوئے ہیں! یہ ہے مہذب قوموں میں عزت و شرافت کا معیار؟ یہ ہے گوری نسلوں میں بدکاری اور بدوضعی کا اعزاز! گئے وہ دن جب مسلمانوں کو اپنی ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور سیدۃ النساء فاطمہ زہرا (رضی اللہ عنہا) کی پاک پاکیزہ زندگیوں پر فخر تھا۔ وہ زمانہ بھی گیا جب ہندوستان کی ایک دوسری قوم سیتاجی اور ساوتری کا

نام لیا کرتی تھی۔ اب اگر زمانے میں عزت کے ساتھ رہنا ہے، اگر اپنا شمار مہذب و متمدن قوموں میں کرانا ہے، اگر اپنی تعلیم و تہذیب کا ثبوت دینا ہے تو رنڈیوں کی تعظیم کیجیے، سازندوں کو اپنا بزرگ تسلیم کیجیے۔ ایکٹروں کے لیے عزت کی کرسی خالی کیجیے اور ہو سکے تو ہر حرام کو حلال ہی نہیں، مقدس و محترم بھی سمجھنے لگیے۔

''لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

(سچ 4 جنوری 1929)

مکہ اور لندن:

اُم القرا (مکہ معظمہ) کی یہ روایت انگریزی اخبارات میں بھی نقل ہو کر پہنچی ہے کہ فلاں ہفتہ کے اندر مکہ معظمہ میں نہ کسی قسم کے جرم کی کوئی واردات ہوئی اور نہ کسی شارع عام پر کوئی حادثہ پیش آیا۔ مکہ حجاز کا دارالسلطنت ہے پورا ایک ہفتہ گزر جاتا ہے اور نہ کہیں موٹروں کے ذریعے سے ڈاکے پڑتے ہیں، نہ کہیں دن دہاڑے بینک لٹتے ہیں، نہ کہیں نقب لگتی ہے۔ نہ کوئی گولی چلتی ہے، نہ کوئی ریوالور سے ہلاک ہوتا ہے نہ سڑکوں پر چلنے والے راہ گیر کوئی دب کر یا کچل کر مرتے ہیں۔ حجاز کے پایۂ تخت کے مقابلے میں برطانیہ کے پایۂ تخت، امریکہ کے پایۂ تخت، فرانس کے پایۂ تخت، جرمنی کے پایۂ تخت، باوجود اپنی پولیس اور اپنی خفیہ پولیس، اپنی میونسپلٹی اور اپنے کارپوریشن، اپنے قانون اور اپنی عدالتوں، اپنے نظام اور اپنے انتظام، اپنی اعلیٰ تعلیم اور اپنی عام تعلیم، اپنے کالجوں اور اپنی یونیورسٹیوں کے ذرا اپنے ہاں کے جرائم اور حوادث کا ریکارڈ پورے ایک ہفتہ کا نہ سہی، نصف ہفتہ کا، ربع ہفتہ کا، یہ بھی نہ سہی صرف ایک دن ہی کا ذرا نکال کر دیکھ لیں! ''اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا''۔ [1]

حجاز میں آج عمر فاروقؓ کی حکومت نہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کی بھی حکومت نہیں، سلطان ابن مسعود کی حکومت ہے جو ''ملک'' اور ''سلطان'' ہے۔ روشن خیالوں کی جمہوریت، اس تاریک خیال کی ملکیت ہی کا مقابلہ کر سکتی ہوتی! یاروں کی ''بہار'' کاش ہم غریبوں کی 'خزاں' ہی کا مقابلہ کر سکتے!

(سچ 7 مارچ 1930)

بازارِ حسن:

کیلی فورنیا (امریکہ) سے خبر آئی ہے کہ وہاں کی پولیس نے شہر کے دو مشہور نامور مخصوصوں کو اس جرم میں گرفتار کیا ہے کہ انھوں نے ایک مستقل و باضابطہ ''بازارِ حسن'' کھول رکھا تھا۔ یہ بازار ایک مخفی مقام پر آدھی رات کی اندھیریوں میں لگتا تھا۔ 16 سے لے کر 20 سال کی عمر تک کی نوجوان و خوب رو لڑکیاں سو کی تعداد میں اس بازار کی جنس تھیں۔ ہر شب حسن و رعنائی کا مول تول بہ طریق تجارت و دوکانداری نہیں ہوتا تھا بلکہ گویا یہ بطور نیلام بولیاں بولی جاتی تھیں اور ایک معلمہ لڑکیوں کو اس فلسفہ کی تعلیم دیتی رہتی تھیں کہ بدی اور بدنامی اور بدکاری محض خیالی چیزیں ہیں۔ ان میں خرابی ہی کیا ہے۔

(نیوز آف دی ورلڈ لندن 15 مارچ 1931 ملخصاً)

'بازارِ حسن' کے نام سے دو چار سال ہوئے اردو کے ایک افسانہ نویس [2] نے اردو میں ایک کتاب لکھی تھی۔ مشرق میں وہ افسانہ تھا مغرب نے واقعہ بنا دیا اور پھر عصمت فروشی اور سیہ کاری کے جن حدود کو ''نئی دنیا'' کا قانون جرم قرار دے ان کا تو ہم ''پرانی دنیا'' والے شاید صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔''

(سچ 10 اپریل 1931)

برطانوی ولاوروں کا کمال شقاوت:

آرنلڈ بینٹ [3] آنجہانی، انگریزی داں طبقہ جانتا ہے کوئی معمولی لوگوں میں نہیں۔ بعد ویلز اور شا کے اس کا شمار برطانیہ کے معزز اہل قلم میں ہے۔ انگریزی آبادی میں اس کا حرف حرف قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ڈائری، زمانہ جنگ عموی کی، آجکل لندن کے روز نامہ ''ڈیلی ایکسپریس'' میں نکل رہی ہے۔ 23 نومبر 1932 کے پرچہ کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ ہو:

دوشنبہ 4 اکتوبر 15ھ۔ آج مسز جی نے بیان کیا کہ کوین الگزنڈرا اسپتال (ہل بینک) میں ان سے اور ایک نوجوان سبالٹرن (جمعدار) سے باتیں ہو رہی تھیں۔ جو دردانیال سے زخمی ہو کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک روز خاردار تار لگانے کی ضرورت تھی اور کوئی ستون موجود نہ تھے۔ قریب ہی ترکوں کی لاشیں بہت سی پڑی ہوئی تھیں جو سوکھ کر کڑی ہو گئی تھیں۔ بس انھی کو اٹھا اٹھا کر زمین میں انھیں ستون کی طرح گاڑ کر تار ان کے سروں سے باندھ دیے گئے۔ مسز گرین نے یہ روایت بیان کر کے ہم سے کہا کہ جو انیس انیس سال کے نوجوان اس تربیت کے خوگر ہو کر آئیں گے وہ آگے چل کر کیا ہوں گے؟

حشر میں جس جس طرح پردے اٹھیں گے اور خود اپنے ہاتھ پیر اپنے خلاف جس طرح گواہی دیں گے اسے چھوڑیے۔ یہ پردے تو ابھی ہمارے آپ کی سب کی نظروں کے سامنے اٹھ رہے ہیں۔ برطانیہ کے دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں، خود برطانیہ ہی کے فرزندوں کے ہاتھ سے! خلافت راشدہ کے دور سے قطع نظر کیجیے۔ محمود بت شکن اور اورنگ زیب ظالم و متعصب کو لیجیے۔ کیا ہمارے ان ظالموں اور بے رحموں نے کبھی بھی بت پرستوں اور باغی مشرکوں کی لاشوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا ہے۔

(سچ 23 دسمبر 1933)

اردو صحافت میں فکاہی کالم لکھنے کی روایت قدیم ہے۔ الہلال (کلکتہ اجرا 1912) زمیندار (لاہور اجرا 1912) ہمدرد (دہلی اجرا 1913) میں سیاسی خبروں کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اودھ پنچ کا عنوان ''موافقت زمانہ'' الہلال کا عنوان ''افکار و حوادث'' زمیندار کا فکاہی کالم افکار و حوادث، ''ہمدرد'' کے فکاہی مضامین نے صحافت کو طنز و مزاح سے بہت قریب کر دیا تھا لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے طنز کا جو انداز وضع کیا وہ ان سے قبل ناپید تھا۔ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہٖ نقل کر دی جائے پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا صدق و سچ سے پہلے شاید اردو دنیائے صحافت کے لیے نامعلوم تھا۔

(آپ بیتی۔ مطبوعہ لکھنؤ سنہ ندارد ص 222) 4

مولانا ماجد کی پیش کردہ ان خبروں کی سرخیاں بھی بڑی جاندار اور ادبیت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ یہ خبر پر پوری طرح چسپاں بھی ہو جاتی تھیں۔ بسا اوقات خبر کی سرخی خبر کی تلخیص معلوم ہوتی ہے۔ سال 1927 کے شماروں سے بعض سرخیاں سطور ذیل میں درج کر رہا ہوں ان سے مولانا کے اختراعی، شاعرانہ اور طنزیہ ذہن و مزاج کی عکاسی ہوتی ہے:

زیردستوں کا زبردست حملہ، فرزانوں کی دیوانگی، کشتگان وفا کی حسرت نصیبی، خاموشوں کی گویائی، صیاد کا رحم اہل قفس پر، نادانوں کی دانائی، اہل ناز کا نیاز، روشنی بے نور، خلوت کا اندازہ جلوت سے، قید عصمت سے آزادی، اعداد خاموش کی گویائی، زود پشیماں کی پشیمانی، اہل عقل کا کمال نقل، بلندیوں کی پستیاں۔ مظلوم کا ظلم وغیرہ۔

مذکورہ سرخیوں میں رعایت لفظی اور صنعت تضاد کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ صنعتوں کے استعمال نے ان کے لفظی و معنوی حسن کو دوبالا کر دیا ہے اور مشرق و مغرب کے متضاد فکری و تہذیبی مفہوم کو فروغ بخشا ہے۔ سچ کی فائلوں میں ان لطیف اور معنویت سے بھرپور سرخیوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شعر فی البدیہہ کی طرح ان کے ذہن سے برآمد ہو گئے ہوں، ان کی تلاش اور انتخاب میں کاوش ذہنی کا مطلق دخل ہی نہ ہو۔

کہیں کہیں خبروں کی سرخیوں میں مصرعے یا مصرعے کے اجزا اور خبر کے آخر میں کسی برمحل شعر کا استعمال طنز کی شدت کو بڑھانے اور مفہوم کو دل پذیر و دل پسند بنانے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ غرض کہ یہ سرخیاں ان کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں۔

29 دسمبر 1933 کی اشاعت کے ساتھ ہفتہ وار ''سچ'' مرحوم ہو گیا۔ دو برس بعد 1935 میں یہی پرچہ 'صدق' کے نام سے جاری ہوا بعد میں اس کا نام 'صدق جدید' ہو گیا۔ غیر ملکی اور ملکی خبروں کی پیشکش کا مذکورہ انداز بدستور قائم رہا۔

اردو صحافت میں مولانا کے اس طرز خاص کی تقلید کوئی نہیں کر سکا۔ اگرچہ 'ملاپ' کی چٹکیاں، 'پرتاپ' کی گپ شپ اور بیسویں صدی (دہلی) کے 'تیر و نشتر' نے مقبولیت حاصل کی مگر ''وہ بات کہاں......''۔

اردو صحافت میں خبروں پر تبصرے و تجزیے عموماً لکھے جاتے ہیں۔ خبروں کے مضحک پہلو تلاش کر کے ان پر طنز بھی کیا جاتا ہے لیکن احتسابی انداز اختیار کرتے ہوئے طنز ملیح کا سہارا لے کر رعایت لفظی اور ادبی اسلوب کی تمام تر رعنائیوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان خبروں سے عبرت، غیرت، شرم، انصاف، اخلاق تہذیبی تصادم کے پہلو نکالنا مولانا ہی کا حصہ تھا۔ آج ضرورت ہے کہ مولانا کے اس طرز خاص کو بھی صحافت کے مطالعے کے دوران موضوع گفتگو بنایا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ مغرب کا اپنے علوم، اپنے کلچر، اپنی سائنس پر جو ناز تھا اس کے خلاف 'مشرق کی آواز' اٹھانے والوں میں اکبرالہ آبادی کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام سرفہرست ہے۔ زیر گفتگو خبروں کو یکجا کر کے مناسب تعارف و تنقید کے ساتھ اگر شائع کر دیا جائے تو اردو صحافت کی تاریخ میں خبرنویسی کے ایک نئے پہلو اور انداز کا اضافہ ہوگا۔

حواشی:

1. آیت: 14: سورۃ: بنی اسرائیل۔ ترجمہ: (پڑھ لے اپنی کتاب (نامہ اعمال) آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہے۔
2. یہ اغلباً منشی پریم چند (ف 1936) کے ناول بازار حسن کی طرف اشارہ ہے۔ اس ناول کے ایڈیشن کا حصہ اول 1921 میں دارالاشاعت لاہور سے اور حصہ دوم 1922 میں اسی ادارے سے شائع ہوا تھا۔ ہندی میں یہ 'سیوا سدن' کے نام سے بھی شائع ہوا۔
3. ناول نگار (1867-1931) Arnold Bennet، ناول نگار مورخ۔ H.G. Wells (1866-1946)، ڈرامہ نگار، ناقد۔ G.B. Shaw (1856-1950)۔

□□□

رابطہ:

58, New Azad Puram Colony
Chawni Ashraf Khan, Izzat Nagar
Bareilly-243122 (U.P.)

اقبال محی الدین

سائنس کی ترقی اور مائیکرو چپس

سائنسی ترقی نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ خواہ وہ معدنیات، صنعت وحرفت اور زراعت ہوں یا بجلی کے سامان، کثیر المقاصد منصوبے، ایٹمی توانائی، صحت و ادویات، ماحولیات کی کثافت، دفاعی سامان، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلکس اور ریموٹ سینسنگ جیسے اہم پہلو ہوں۔ سائنسی تحقیق نے زندگی کے بہت سے اہم مثبت حقائق سے روشناس کرایا جس نے انسانی زندگی کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی میں الیکٹرانکس کے شعبے کی ایک کلیدی حیثیت ہے۔ یہ شعبہ ایٹمی توانائی، خلا، مواصلات، دفاع، تعلیم، زراعت، مینوفیکچرنگ اور تفریح کے شعبوں کے علاوہ روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور قومی ترجیحات کو پورا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ملک کی تعمیر و ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے جو بنیادی طور پر پیداوار بڑھانے اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کام کر رہا ہے۔ الیکٹرانکس عالمی معیشت کے سب سے زیادہ ترقی پذیر شعبوں میں سے ایک ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل انفارمیشن ٹیکنالوجی میں جو انقلاب دیکھنے میں آرہا ہے اسے دوسرے ’’صنعتی انقلاب‘‘ سے تعبیر کیا جارہا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تفصیل میں جائیں، ہمیں سائنس کی ترقی کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم زراعتی ترقی کی بات کرتے ہیں جس کے فروغ میں سائنس کا اہم رول رہا ہے۔ آزادیٔ ہند کے بعد ملک میں ہمارے کسان باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے اتنا بھی غلہ پیدا نہیں کر پارہے تھے کہ ملک کی غذائی ضرورت کو پورا کیا جاسکے۔ اسی لیے ہمیں باہری ممالک سے غلہ منگانا پڑتا تھا۔ لیکن جدید سائنسی طریقوں، مشینوں اور اوزاروں کی مدد سے اس پر قابو پانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں 66-1965 میں اناج کی اتنی پیداوار ہوئی جو ہماری ضرورت سے بھی زائد تھی۔ اسی لیے اس کو ’’سبز انقلاب‘‘ یا Green Revolution کے نام سے منسوب کیا گیا۔ پھلوں کے باغات بھی کافی بڑھے اور پھولوں اور سجاوٹی پودوں کی اَن گنت قسمیں تیار کی گئیں۔ بایوٹیکنالوجی کی اہمیت کے پیش نظر ملک میں تحقیقی کام شروع ہوا۔ اور 1986 میں باقاعدہ طور پر بایوٹیکنالوجی کا ادارہ دہلی میں قائم ہوا۔ اس تکنیک کی مدد سے پھولوں، پھلوں، سبزیوں اور اناج کی پیداوار عمدہ اور بہت زیادہ ہونے لگی۔ بایوٹیکنالوجی کی مدد سے نیشنل ڈیری انسٹی ٹیوٹ، کرنال اور نیشنل ڈیولپمنٹ بورڈ، آنند میں جین کی منتقلی کیا جانا ممکن ہوا۔ گایوں اور بھینسوں کے دودھ میں ایک سیزن کی پیداوار پانچ ہزار لیٹر تک پہنچ گئی جس کو ’’سفید انقلاب‘‘ یا White Revolution کا نام دیا گیا۔

مچھلی کی کل پیداوار جو 1951 میں 27 ملین ٹن تھی، بڑھ کر 200 ملین ٹن ہوگئی۔ سائنس کی جدید تکنیک سے مچھلی کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ ایک ہیکٹیر تالاب میں 10 ٹن تک مچھلی پیدا کیا جانا ممکن ہو سکا۔ اس طرح اس کو ’’نیلا انقلاب‘‘ یا Blue Revolution کا نام دیا گیا۔

معدنیات قدرت کا ایک قیمتی تحفہ ہے جو ہماری زندگی کے لیے بے حد مفید ہے۔ یہ تحفہ ہندوستان کو عطا کرنے میں قدرت نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں معدنیات کثرت سے پائی جاتی ہے جس سے ملک کی معاشی حالت پر اچھا اثر ہوا ہے۔ ان معدنیات کو سائنسی طریقے سے استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ ہندوستان خوش قسمتی سے چند بنیادی معدنیات کا حامل ہے جن پر اس کی جدید صنعتوں کا دارومدار ہے۔ خام لوہا، لوہے اور اِسٹیل کی صنعت کے لیے اہم خام مال ہے اور ہندوستان اعلیٰ قسم کے لوہے سے پوری طرح مزین ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کوئلہ، مینگنیز، ابرق، باکسائیٹ، تانبا، سونا، نمک، السنائیٹ، موناز ائیٹ، زرکون، لائم اسٹون اور ڈولومائیٹ جیسی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ سائنسی طور پر معدنیات کو کارآمد بنایا جاتا ہے جو انسانی زندگی کے لیے بیش بہا قدرت کا تحفہ ہے۔

بھاری انجینئرنگ اور مشینی صنعت نے بھی سائنس کی ترقی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اب ہندوستان میں مشینیں بننے لگی ہیں۔ کپڑا، سیمنٹ، شکر، کاغذ اور کان کنی کی صنعتوں کے لیے بھی مشین ملک میں تیار ہونے لگی ہیں۔

نقل وحمل کی صنعت میں بھی سائنس کا بیش بہا کارنامہ رہا ہے۔ ریل کے ڈبّے اور انجن ہندوستان میں بنتے ہیں۔ بھاپ انجن، ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے ریلوے انجن چترنجن میں بنائے جاتے ہیں۔ چھوٹی لائن کے انجن جمشید پور میں بنتے ہیں۔ چنئی کے قریب پیرم بُور میں ریل سواری گاڑی کے ڈبّے تیار کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جہاز سازی کے چار بڑے کارخانے دشاکھا پٹنم، کولکاتا، ممبئی کے نزدیک مزگاؤں اور کوچین میں ہیں۔ مزگاؤں کے جہاز سازی

کارخانے میں ہندوستانی بحری فوج کے لیے جنگی جہاز بنتے ہیں۔ یہاں مسافر اور باربردار جہاز بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے انسان نے زمین تو زمین سمندروں تک، اپنی حکمرانی قائم کرلی ہے۔

ہندوستان میں ہوائی جہاز کی صنعت ابھی حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ اس کے اہم مراکز ہیں بنگلور، کان پور، ناسک، حیدرآباد اور لکھنؤ۔

ہندوستان متعدد کیمیائی اشیا اور ادویات تیار کرتا ہے۔ اس صنعت کے پبلک سیکٹر میں حکومت نے کئی کارخانے قائم کیے ہیں۔ اینٹی بایوٹک ادویات بنانے میں ملک خودکفیل ہو چکا ہے۔ سائنسی ترقی سے انسانی صحت اور زندگی دونوں محفوظ ہو گئے ہیں۔

معدنی تیل کو صاف کرنے اور پیٹروکیمیکل کی صنعت میں بھی سائنس کا اہم کردار رہا ہے جس نے انسانی زندگی کو خوشحال بنادیا ہے۔ آسام اور گجرات اور ممبئی ہائی میں تیل کی تلاش کی کوششیں کامیاب ہوئی ہیں۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے ڈگبوئی، ٹرامبے، وشاکھاپٹنم، گوہاٹی، چنئی، کوچین، متھرا اور برونی میں ہیں۔

پیٹروکیمیکل ایک نیا صنعتی میدان ہے جس میں ترقی کے لیے بے انتہا امکانات ہیں۔ ہندوستان میں معدنی تیل سے متعدد چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ مشینی تیل، پلاسٹک، نائیلون اور پولیسٹر اور مصنوعی ربر پر مشتمل ہیں۔ پیٹروکیمیکل کے بڑے کارخانے گجرات میں بڑودہ (Vadodra) کے قریب اور مہاراشٹر میں ممبئی کے قرب و جوار میں واقع ہیں۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ پیٹروکیمیکل کی صنعت میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔

انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ چاند اور دوسرے سیاروں تک رسائی حاصل کرسکے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ہوائی جہاز، ہیلی کوپٹر وغیرہ کے سہارے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا رہا ہے۔ مگر دن بہ دن اس کی بڑھتی ہوئی خواہش کہ خلا میں کیا ہے؟ اور اس کے آگے بھی کیا ہے؟ اس خواہش نے اور انسانی دماغ نے سٹیلائٹ کو جنم دیا جس کے سہارے وہ چاند اور دوسرے سیاروں کی طرف بڑھنے لگا۔ چاند پر تو اس نے قدم بھی رکھ دیے اور مریخ کی طرف بھی گامزن ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی طرح انسان اپنی مسلسل کاوشوں سے سائنسی ترقیات کو عملی جامہ پہناتا رہا اور نہ صرف زمین کا ہی فاتح بنا بلکہ خلا کا بھی فاتح بن گیا۔ اس کی اس فتح میں سائنس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔

ہندوستان کا خلائی پروگرام نومبر 1963 میں شروع ہوا۔ اس کا سہرا سارا بھائی کے سر ہے جن کی کوششوں سے پہلی بار تھمبا (کیرالا) سے ایک تیز رفتار راکٹ خلا میں چھوڑا گیا۔ اس سلسلہ کی ابتدا ہی کی بدولت آج ہم خلائی دوڑ میں کافی پیش رفت کرسکنے کے اہل بن پائے۔ 1975 میں پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ خلا میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک 16 مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کے انسیٹ نام کے مصنوعی سیارے بہت کامیاب ثابت ہوئے جن کی مدد سے موسمیات کے بارے میں معلومات اور ٹی.وی. پروگراموں کا ریلے دور دراز کے علاقوں تک ممکن ہو سکا۔ انسیٹ-II-ڈی نام کے مصنوعی سیارے کو 4 جون 1997 کو خلا میں پہنچایا گیا جو ملک بھر میں ٹی.وی. پروگراموں کو ریلے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایشیا کے بیشتر حصوں تک پہنچا رہا ہے۔ انسیٹ E-II خلا میں پہنچنے کے بعد موسمیات کی اور زیادہ معلومات فراہم کرا رہا ہے۔ ان مصنوعی سیاروں کو Launching Vehicles کے ذریعہ خلا میں بھیجا جاتا رہا ہے جن میں SLV-III، SLV-A اور PSLV کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سائنس کی ترقی کی بہترین مثال ہیں یہ مصنوعی سیارے جو خلا میں چھوڑے جاتے ہیں جن سے بنی نوع انسان کی بہبودی اور ترقی ہوئی ہے۔

سائنس کی ترقی کی بہترین مثال ہے نیوکلیائی توانائی جس کے پُرامن مقاصد اور ملک کی ترقی کے لیے استعمال کی غرض سے ڈاکٹر ہومی بھابھا کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں۔ 1956 میں جاپان اور چین نے پہلے ہی ہمارے ملک میں اپسرا (Apsara) نام کا پہلا ایٹمی ری ایکٹر قائم کیا۔ اس کے بعد توانائی حاصل کرنے کی غرض سے تاراپور میں پہلا پاور ری ایکٹر قائم کیا گیا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کوٹا (راجستھان)، کلپکم (تامل ناڈو)، نرورا (اتر پردیش) اور کاکراپار (گجرات) میں بجلی حاصل کرنے کے لیے پاور ری ایکٹر قائم کیے گئے۔ بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر کے ذریعہ بہت سے عناصر کے ریڈیوآئی سوٹوپس بڑی مقدار میں تیار کیے جاتے ہیں جن کا استعمال کئی امراض کی تشخیص اور علاج میں کیا جاتا ہے۔ جسم کی کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ پیٹرولیم کی زمین دوز پائپ لائنوں میں رساؤ کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ تاب کاری شعاعوں کے ذریعہ کھانے پینے کی اشیاء کو جراثیم سے پاک کرکے انھیں لمبے عرصے تک محفوظ رکھا جاتا ہے۔

جدید سائنس نے ہمیں ریموٹ سینسنگ جیسی ٹیکنالوجی عطا کی ہے جس سے زمین کے اوپر یا زمین کے اندر چھپے ہوئے قدرت کے خزانے کا پتہ چل جاتا ہے۔ پانی کے ذخائر کا علم ہو جاتا ہے اور معدنیات کس کس جگہ پائی جاتی ہیں اس کا علم بغیر زمین کو کھودے ہوئے ہو جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں جدید جنیٹک انجینئرس نے کلوننگ کی تکنیک ایجاد کی ہے جس سے ہم شکل جاندار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ DNA اور RNA اور ان کے Permutation اور Combination of Genes کے ذریعہ من چاہی نئی زندگی پیدا کی جا سکتی ہے جس کی شکل و صورت، عادات و اطوار اور آواز

بالکل اسی طرح کی ہوگی جس کا کلون بنایا گیا ہے۔

الیکٹرانک کی صنعت بھی انسان کے لیے سائنس کا بہترین تحفہ ہے۔ فرج، واشنگ مشین، بجلی کے پنکھے، کولر اور ایر کنڈیشن، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، ریڈیو، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر اور وی سی آر وغیرہ سب ہندوستان میں بننے لگے ہیں۔ ملک میں اعداد وشمار کی مشین اور کمپیوٹر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ آج دنیا کی چوتھی سب سے بڑی صنعت الیکٹرانک مصنوعات کو تیار کرنے میں ہمارا ملک کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ فیکس، ٹیلکس، سیلولرفون یا موبائل ملک میں ہی تیار کی جاتی ہیں۔

ہندوستان نے دفاعی سائنس میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ ''پرتھوی''، ''آکاش''، ''ترشول''، ''ناگ''، ''اگنی'' جیسے میزائیلوں کو کامیابی کے ساتھ داغا جا چکا ہے۔ ''ارجن'' نام کا جدید قسم کے آلات اور ہتھیاروں سے لیس ٹینک تیار کر کے ہماری فوجوں میں حال ہی میں شامل کیا گیا ہے۔ جو اس میدان میں سائنسی ترقی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

یہ تو رہی بات سائنس کی ترقی کی جس نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے۔ اب ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اس سے جڑے اہم سائنسی آلات، کمپیوٹر اور مائکروچپس کی بات کریں گے۔

کمپیوٹر کی تعلیم کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اطلاعات یا انفارمیشن ایک اہم لفظ ہے جس کا کمپیوٹر سے گہرا تعلق ہے۔ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ پوری طرح اطلاعات پر مبنی ہے۔ کمپیوٹر اور انسانی زندگی کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ بغیر علم کے ہم کوئی بہتر کام نہیں کر سکتے۔ کمپیوٹر میں کوئی انفارمیشن ڈالتے ہیں تو وہ مشین کے اندر فوراً Process ہوتی ہے اور نتیجہ باہر آجاتا ہے۔ اب ہمیں یہ جاننا ہے کہ آخر یہ کمپیوٹر کیا چیز ہے اور اس میں مائکروچپس کی کیا اہمیت ہے؟

دراصل کمپیوٹر ایک مشین ہے جو انفارمیشن کو Process کرتی ہے یا جمع کرلیتی ہے۔ اس میں تین اہم حصے ہوتے ہیں۔ ایک Input جس میں اطلاعات ڈالی جاتی ہیں۔ وہ Central Processing Unit (CPU) کو پاس کر دیتا ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہے۔ یہ CPU دراصل کمپیوٹر کا دماغ ہوتا ہے جہاں ساری اطلاعات جمع رہتی ہیں اور ان کی Processing ہوتی ہے۔ تیسرا حصہ Output ہے جہاں ہمیں نتیجہ ملتا ہے۔ کمپیوٹر ایک بہت تیز کام کرنے والی مشین ہے جس میں ساری انفارمیشن بالکل صحیح طریقہ سے Process ہوتی ہے اور تھوڑی سی جگہ میں بہت ساری انفارمیشن آجاتی ہے۔ یہ مشین چوبیسوں گھنٹے کام کرسکتی ہے اور وہ سارے کام کرسکتی ہے جو ناممکن ہوتا ہے۔

انسانی دماغ میں بھی انفارمیشن جمع ہوتی ہے اور اس کا تجزیہ ہوتا ہے۔ انسانی دماغ سے بڑا کوئی کمپیوٹر نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل جدول انسانی دماغ کی Capacity ظاہر کرتی ہے:

اطلاعات کی قسموں کا اسٹور اور ان کی وسعتیں:

اسٹور کی قسمیں	وسعت (ملین کیریکٹر)
انسانی دماغ	125000000
یو. ایس نیشنل آرکائیو	112500000
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا	12500
میگنیٹک ہارڈ ڈسک	313
فلاپی ڈسک	2.5
کتاب	1.3

مائکروچپس کی وجہ سے کمپیوٹر بہت چھوٹا ہوتا ہے جو سلی کون کا بنا ہوتا ہے۔ اسی سلی کون چپ میں ساری انفارمیشن بھری جاتی ہیں۔ ان ہی مائکروچپس کی وجہ سے کمپیوٹر بہت خوش اسلوبی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مائکروچپس کمپیوٹر کے CPU میں لگایا جاتا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ انفارمیشن اسٹور ہو سکے۔ ان اطلاعات کی Processing بھی یہیں ہوتی ہے اور Output میں اس کا نتیجہ بہت جلد آجاتا ہے۔ چپ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہم کمپیوٹر سے جو امید کرتے ہیں وہ سب ہمیں مل جاتا ہے۔ وہ بہت چھوٹا ہوتا ہے جس میں Storage Capacity بہت زیادہ ہوتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔

چپ ایک طرح کا Micro Processor ہوتا ہے جس میں بجلی کے سرکٹ ہوتے ہیں جو CPU سے جڑا ہوتا ہے۔ دراصل یہ کمپیوٹر کا دماغ ہوتا ہے۔ چپ کی ایجاد سے کمپیوٹر روزمرہ کی ساری چیزوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ Micro Processors کو کرس، کار، ویڈیو ریکارڈس، الیکٹرانک کیمرے، الیکٹرک ڈرل، پاکٹ کیلکولیٹرس، پٹرول پمپ اور واشن مشین وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔

Micro Processors صنعتوں میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ Robots (روبو) کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کاروں کے بنانے میں روبوٹ بہت تیزی سے کام کرتے ہیں۔ برٹش لے لینڈ گاڑیوں کے سائیڈ پینل روبو کی مدد سے لگائے جاتے ہیں جو 25 سیکنڈ میں 250 دھکتے ہوئے پینل (Panels) کو لگا دیتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مائکرو پروسیسر کی مدد سے ہماری فیکٹریوں میں روبو کے ذریعہ

کام لیا جائے گا۔

مائیکرو چپس اور کمپیوٹر کا استعمال ہماری بہت سی ضرورتوں کو پوری کرتا ہے۔ جن میں خاص طور سے ملٹری انجینئرنگ، ادویات، تجارت وصنعت کے میدان ہیں۔ کھانے کے سامان کو تیار کرنے اور ان کو لمبے عرصہ تک محفوظ رکھنے میں بھی مائیکرو چپس کا بہت اہم کردار ہے۔ کمپیوٹر ہماری بہت سی کارگزاریوں میں بھی مدد کرتا ہے۔ مثلاً نقل وحمل، مواصلات، دفاع اور سائنسی ریسرچ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مائیکرو کمپیوٹرس ذاتی حساب رکھنے، ریکارڈ رکھنے، انرجی کنزرویشن اور محافظت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سلی کون کا استعمال کمپیوٹر کے علاوہ دفاعی اور شہری کاموں میں بھی ہوتا ہے۔ سلی کون ویفر سورج کی کرنوں کو بجلی میں تبدیل کرنے کے لیے اور Semi Conductor Devices کو بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انھیں Intigrated Chips کہتے ہیں جو خلائی اور میزائیل پروگرام میں استعمال ہوتا ہے۔

ترقی کے مختلف میدانوں میں نینو ٹیکنالوجی کا اہم رول ہے۔ خاص طور پر کمپیوٹر سائنس اور طبی میدان میں۔ کمپیوٹر کے میدان میں اس کے ذریعہ انقلاب آنے کے امکان پیدا ہو گئے ہیں۔ سپر کمپیوٹر اسی نینو ٹیکنالوجی کا ہی نتیجہ ہے۔ اس میں Connector کی شکل میں نینو وائر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وائر کے لگتے ہی کمپیوٹر کی Memory کی رفتار تقریباً دس لاکھ گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ اس تکنیک کا استعمال اب کمپیوٹر چپ (Chip) کے سرکٹ تیار کرنے میں بھی کیا جانے لگا ہے جو عام چپ کے مقابلے اچھے نتائج فراہم کرتی ہے۔

کمپیوٹر اور اس کے مائیکرو چپس تعلیم کے میدان میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ تعلیمی میدان کے مختلف ادوار کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ جیسے ایڈمنسٹریشن ڈیٹا پروسسنگ پڑھائی جس میں کمپیوٹر کی مدد سے ہدایت دی جاتی ہیں۔ تشخیص (Prescription) اور Management of Learning Resources جس میں Computer-Managed Instructions ہوتی ہیں۔ گائیڈینس جس میں Vocal Counseling ہوتی ہے۔ تحقیق جس میں فرضی ماخذ (Simulation) کا تجزیہ ہوتا ہے۔

درس وتدریس کے میدان میں کمپیوٹر مختلف Modes میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیسے Tutorial, Drill، پریکٹس، فرضی ماخذ، کھیل، تجربہ گاہوں کے تجربات مسائل کو حل کرنے اور Creative/Artistic Projects وغیرہ۔

تجربہ گاہوں کے تجرباتی Modes میں ایک طالب علم پروگرام کا ایک پیکج چنتا ہے۔ مثلاً SPSS یعنی Statistics Package for Social Sciences جس میں وہ اس طرح کا پروگرام لیتا ہے جیسے Facilities (ہائی اسپیڈ پرنٹر) اور اعداد وشمار کو استعمال کرتا ہے تاکہ نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرا ٹول یعنی اپنے دماغ کا استعمال کرتا ہے، تاکہ نتیجہ اور تجزیہ ہو جائے۔ اگر مائیکرو چپس میں یہ ساری اطلاعات صحیح دی گئی ہوں تو کمپیوٹر نتیجہ صحیح دے دے گا۔

Problem-Solving Modes میں کمپیوٹر ایک "ذہین ٹول" کا کردار ادا کرتا ہے۔ کمپیوٹر پروگرامنگ ایک ضروری صلاحیت کا حامل ہے۔ پروگرامنگ سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے کیونکہ کمپیوٹر ایک بہت تیز اور صحیح نتیجہ اخذ کر کے کسی کے بھی تصور کی جھلک کو نتیجہ کی شکل میں ظاہر کر دیتا ہے۔ یہاں کمپیوٹر ایک آئینہ کا کردار ادا کرتا ہے کیونکہ پروگرامنگ دینے والے کے خیال و ذہن کی وہ عکاسی کرتا ہے۔

Creative Mode میں کمپیوٹر ایک ایسا ٹول بن جاتا ہے جس سے کوئی بھی اپنے کو Artistic کے طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا ٹول مہیا کر دیتا ہے جس سے گانا، الیکٹرانک برش تصویر بنانے کے لیے یا اسکیچ پیڈ ڈرائنگ کے لیے بنایا جا سکتا ہے۔ یہ سارے معجزے مائیکرو چپس کی مدد سے کیے جا سکتے ہیں۔

اقتصادی سرگرمیوں، موثر نظم ونسق اور انسانی وسائل کے فروغ کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ صنعت کے مقابلہ کی صلاحیت بڑھانے، کم یاب سرمایہ جاتی وسائل کا بہتر استعمال کرنے، سماجی خدمت بہ حسن وخوبی فراہم کرنے اور کھلی اطلاعات کا کلچر پیدا کر کے سماج کو عالمی طور پر مربوط کرنے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مزید توسیع وترقی کی کوشش کی جا رہی ہیں۔ معیشت کے مختلف شعبوں مثلاً بینکنگ، انشورنس، مالی سروسز، اسٹاک ایکسچینج، انکم ٹیکس، ریلوے، ایرلائن، تیل، بجلی، دفاع، پولیس، صنعت، سرکاری دفاتر، تعلیمی وتحقیقی اداروں وغیرہ میں بڑے پیمانہ پر کمپیوٹر استعمال کیے جا رہے ہیں جن میں مائیکرو چپس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح ملک نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہیں۔

□□□

رابطہ:
Nishat Apartment
Near Shamshad Market
Aligarh Muslim University
Aligarh (U.P.)

سید امتیاز الدین

یادوں کے نگار خانے سے

• یہ 1951 کی بات ہے جوش ملیح آبادی جن کو شاید 1933 میں حضور نظام نے ریاست حیدرآباد سے نکلوا دیا تھا حالات اور حکومت کی تبدیلی کے بعد دوبارہ حیدرآباد آئے تھے۔ بہت بڑا مشاعرہ جوش صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ جوش صاحب نے اس موقع پر ایک نظم سنائی تھی جو انھوں نے دہلی سے حیدرآباد آتے ہوئے ہوائی جہاز میں کہی تھی۔ جوش صاحب کی وہ نظم ان دنوں بہت مقبول ہوئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حیدرآباد اے نگار گل بداماں السلام
السلام اے قصۂ ماضی کے عنواں السلام
تو نے کی تھی روشنی میری اندھیری رات میں
مہر و مہ خوابیدہ ہیں اب بھی ترے ذرات میں
میرے قصرِ زندگی پر اے دیار محترم
تو نے ہی کھولا تھا ذوقِ علم کا زریں علم
تو نے ہی بندے کو بخشی تھی کلید اسرار کی
تو نے ہی زلفیں سنواری تھیں مرے افکار کی
ولولوں میں تیرے نغموں کی روانی آئی تھی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کر جوانی آئی تھی
السلام اے بزمِ یاراں اے دیار دوستاں
آج اٹھارہ برس کے بعد آیا ہوں یہاں
دی ہے زخشِ عمر کو گردوں نے اک مدت میں ایڑ
کل جواں رخصت ہوا تھا آج پلٹا ہوں ادھیڑ
آج کھچڑی بال ہیں اور شکل مرجھائی ہوئی
کل تھی اس سر پر جوانی کی گھٹا چھائی ہوئی
حیف یہ لب جن میں اب باقی نہیں آب و نمک
کل تلک آتی تھی ان سے سرخ ہونٹوں کی مہک
آج آب و رنگ ویراں چشم و ابرو ہیں تباہ
کل نہ اس چہرے سے ہٹتی تھی حسینوں کی نگاہ
کیا بتاؤں اے دکن میں زشت ہوں یا خوب ہوں
شہر کا محبوب ہوں اور شاہ کا معتوب ہوں
لیکن اے میرے چمن میری جوانی کے چمن
اے دکن، نسریں دکن، سنبل دکن، سوسن دکن
تجھ میں غلطاں ہے مرے دل کی کہانی آج بھی
پرفشاں تجھ میں ہے میری نوجوانی آج بھی
اب بھی ہے عثمان ساگر کی ہواؤں میں خروش
اب بھی آتی ہیں پہاڑوں سے صدائیں جوش جوش
اس فضا میں ہے قیامت کا ترنم آج بھی
ثبت ہے اک دشمنِ جاں کا تبسم آج بھی
ولولے ناچے تھے جو گھنگھرو پہن کر پاؤں میں
آج بھی رقصاں ہیں تیری بدلیوں کی چھاؤں میں
آؤ سینے سے مرے لگ جاؤ یارانِ دکن
پیشتر! اس کے کہ روئے جوش کو ڈھانپے کفن

یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ نظم کے آخری شعر کو سن کر کئی لوگ اداس ہو گئے تھے لیکن جوش صاحب اس نظم کے بعد بھی 31 برس تک حیات رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جوش صاحب کے چہرے سے حسینوں کی نگاہ ہٹتی تھی یا نہیں یہ تو تصدیق طلب امر ہے لیکن خود جوش صاحب کی نگاہ حسینوں کے چہرے سے نہیں ہٹتی تھی۔ 1951 کے بعد جوش صاحب نے حیدرآباد کے اور بھی مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ 1954 میں اسٹینلی اسکول کے وسیع دالان میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ میں ان دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جوش صاحب کا آٹوگراف لینے کے لیے میں کسی طرح اسٹیج تک پہنچ گیا تھا۔ جب میں نے اپنی آٹوگراف بک اور قلم جوش صاحب کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اُسے لے تو لیا لیکن اس وقت ایک شاعرہ اپنا کلام سنا رہی تھی جس کی ردیف تھی "سلام کہتی ہے"۔ جوش صاحب مسلسل اسی شاعرہ کو دیکھے جا رہے تھے۔ جب ان کو میری آٹوگراف بک کا خیال آیا تو جلدی سے سلام کہتی ہے لکھا اور دستخط کر دیے۔

• جب میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا تو ہماری درسی کتاب میں سر سی۔ وی۔ رمن پر ایک سبق شامل تھا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ سی۔ وی۔ رمن کو خط لکھا جائے اور ان سے آٹوگراف کی درخواست کی جائے۔ مجھے ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بنگلور میں رہتے ہیں۔ میں نے ڈاک کے لفافے پر سی۔ وی۔ رمن بنگلور لکھا اور غلط سلط انگریزی میں ان کے نام ایک خط لکھ کر

پوسٹ کر دیا۔ تیسرے یا چوتھے ہی دن سری.وی. رمن کا جواب آ گیا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ میں اپنی ایک تصویر پر دستخط کر کے تمھیں رجسٹرڈ پوسٹ سے بھیج رہا ہوں۔ تین دن بعد ان کی تصویر مجھے مل گئی جسے آج تک میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔

● آٹوگراف کی بات چلی ہے تو مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے اور میرے اسکول کے ایک ساتھی نے اسکول کے دارالمطالعہ کے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ صدر جمہوریہ راجندر پرساد کی سالگرہ 3 دسمبر کو منائی گئی۔ ہم دونوں نے سوچا کہ صدر کو خط لکھنا چاہیے۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے دوست نے کس زبان میں خط لکھا لیکن میں نے ہندی میں راشٹر پتی کو خط لکھا۔ میرے دوست کو دس بارہ دن کے بعد پریسیڈنٹ کے دفتر سے شکریے کا خط آ گیا جس پر کسی سکریٹری کے دستخط تھے۔ البتہ کچھ دنوں بعد مجھے راشٹر پتی کی پرائیویٹ سکریٹری شریمتی گیان وتی دربار کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ پریسیڈنٹ آپ کا خط پڑھ کر خوش ہوئے۔ وہ جولائی میں حیدرآباد آئیں گے اور ان کی خواہش ہے کہ آپ ان سے راشٹر پتی نیلایم آ کر ملیں۔ اس خط کو پا کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور بے چینی بھی۔ کیونکہ میں نے دسمبر میں خط لکھا تھا اور مجھے سات مہینے تک یعنی جولائی کے مہینے تک انتظار کرنا تھا۔ بہر حال جون 1958 کے آخر میں راشٹر پتی حیدرآباد آئے۔ مجھے راشٹر پتی نیلایم فون کر کے وقت لینا تھا اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ میں نے اپنے بڑے بھائی کے دفتر سے فون کیا۔ شریمتی گیان وتی دربار نے مجھے اتوار 6 جولائی 58 کو صبح گیارہ بجے کا وقت دیا۔ میرے بڑے بھائی اور ان کے ایک دوست رہنمائی کے لیے میرے ساتھ ہو گئے ہم ٹرین سے الوال گئے اور وہاں سے راشٹر پتی نیلایم پہنچے۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں بری طرح بھیگ گیا تھا۔ پھر بھی آٹوگراف بک کو میں نے احتیاط سے پانی سے بچا کر رکھا تھا۔ راشٹر پتی نیلایم کے پورٹیکو میں کچھ فوجی افسر بیٹھے تھے۔ انھوں نے میری آٹوگراف بک گیان وتی جی کے پاس بھیج دی جو اس وقت راشٹر پتی کی پیشی میں تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک اردلی آیا اور اس نے کہا کہ راشٹر پتی آپ کو بلاتے ہیں۔ میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ لیکن راجن بابو نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور کسی چوبدار سے میرے لیے کافی منگوائی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں ہندی کیسے لکھ لیتا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں اسکول میں اردو کے ساتھ ہندی بھی پڑھتا ہوں۔ یہ سن کر راجن بابو نے تین زبانوں انگریزی، ہندی اور اردو میں میری آٹوگراف بک پر دستخط کر دیے۔

● حضرت جگر مرادآبادی بھی اکثر حیدرآباد آتے تھے۔ آخری بار جگر صاحب مئی 1956 میں حیدرآباد آئے تھے۔ لیڈی حیدری کلب میں مشاعرہ ہوا تھا اور انھوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ مشاعرے کی نظامت اختر حسن صاحب کر رہے تھے۔ جگر صاحب نے دو غزلیں سنائی تھیں جن کے مطلع تھے:

صیّاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے
پرواز اسیر پہ پرواز نہیں ہے

دوسری غزل کا مطلع تھا:

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

ویسے تو جگر صاحب مئی کے مہینے میں آئے تھے لیکن وہ کم و بیش تین مہینے حیدرآباد میں مقیم رہے۔ جب جولائی یا اگست 56 میں ان کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ان کے بعض مداحوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ایک آخری مشاعرہ ایسا کیا جائے جس سے ہونے والی آمدنی جگر صاحب کی نذر کر دی جائے۔ مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی اور خمار بارہ بنکوی کو تار بھیجے گئے اور شاید ان شاعروں نے جگر صاحب سے تعلق خاطر کی وجہ سے بلا معاوضہ مشاعرے میں شریک ہونا منظور کر لیا۔ اس مشاعرے میں طرحی مصرع بھی دیا گیا تھا: ''مرے شعرِ رنگیں مرے قلب پارے'' جگر صاحب کی غزل کا مطلع تھا:

مرے شعر رنگیں مرے قلب پارے
ترا ہی تصرف ترے ہی اشارے

اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ سب سے کامیاب شاعر شکیل بدایونی تھے۔ مشاعرے کی نظامت شاہد صدیقی کر رہے تھے۔ ان کے مزاحیہ طرز تخاطب سے مشاعرے کی محفل اکثر زعفران زار ہو جاتی تھی۔ بارش کے دن تھے۔ مشاعرہ کسی بڑے ہال میں ہو رہا تھا۔ لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ بعض لوگ کونے میں رکھی ہوئی خالی میزوں پر بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ اتفاق سے وہیں سے بجلی کا ایک تار بھی گزر رہا تھا۔ اسے چھو لینا کسی کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ شاہد صدیقی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ''حضرات ہال کے آخری حصے میں جہاں کچھ لوگ میزوں پر کھڑے ہیں وہیں بجلی کا تار گزر رہا ہے جس میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ حضرات تار کے قریب سے ہٹ جائیں آپ کا وہاں سے ہٹ جانا آپ کے حق میں بھی بہتر ہوگا اور تار کے حق میں بھی۔''

● مشاعروں میں چشمک اور رقابت تو ہوتی ہی ہے لیکن 50 کی دہائی میں اثر لکھنوی اور فراق گورکھ پوری میں زبردست نوک جھونک رہی۔ پٹنہ سے سہیل عظیم آبادی ماہ نامہ ''تہذیب'' نکالتے تھے اس کے کسی شمارے میں اثر لکھنوی نے فراق پر بڑا سخت مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''عشق یا ہوس''۔ فراق کے کلام میں زبان اور عروض کی غلطیوں کی انھوں نے نشان دہی کی تھی۔ فراق نے کچھ دنوں بعد ایک غزل کہی جس کے دو شعر یہ تھے:

جیسی تنقیدیں اثر لکھتے ہیں ویسی تو ہر اک
پھینک دے گا لکھ کے توفیقِ حماقت چاہیے

میر و سودا پڑھ کے بھی کورے کے کورے رہ گئے
خواندگی سے کچھ نہیں ہوتا بصیرت چاہیے

فراق صاحب کا ایک اور شعر تھا:

زمانے کی رفتار سے بے خبر ہیں
یہ نواب جعفر علی خاں اثر ہیں

''شاہراہ'' دہلی کے ایک شمارے میں فراق صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مقطع تھا:

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت
اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی!

آئندہ شمارے میں اثر لکھنوی نے جوابی غزل شائع کروائی جس کا مطلع تھا:

اثر کو کس نے دیکھا کرتے ہی ہی
کوئی حد ہے فراق اس جھوٹ کی بھی

اس کے بعد اثر صاحب نے اپنی غزل کے ہر شعر میں فراق کی شاعری کے نقائص گنوائے تھے۔ آخری شعر تھا:

بہت کچھ اور کہہ سکتا ہوں لیکن
جواب جاہلاں باشد خموشی

فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں شاعری کی زبان میں یہ ٹو تو میں میں نہ جانے کب تک چلتی رہی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ بعض سمجھ دار لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو ان کے مقام و محل کا واسطہ دیا تب کہیں جا کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔

● ویسے تو فراق اور جوش بھی ہم عصر اور ہم پلہ تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کا لحاظ کرتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جوش صاحب کا انتقال اسلام آباد پاکستان میں 22 فروری 1982 کو ہوا۔ ان دنوں فراق صاحب دہلی میں اپنے کسی دوست کے یہاں مقیم تھے ان کو جب اس سانحے کی اطلاع دی گئی تو وہ بہت غم گین ہو گئے اور ان کا انتقال بمشکل 9 دن کے اندر 3 مارچ 1982 کو ہو گیا۔

● 1980 میں پروفیسر عبدالسلام (جنھیں 1979 میں فزکس کا نوبل پرائز ملا تھا) حیدرآباد آئے تھے۔ اُن کا جوبلی ہال میں استقبال کیا گیا تھا۔ میں جلسہ شروع ہونے سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک صاحب لوگوں میں ایک چھپا ہوا کاغذ تقسیم کر رہے تھے۔ اتنے میں پروفیسر عبدالسلام کچھ لوگوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ اسٹیج پر پہنچنے کے بعد عبدالسلام صاحب کی نظر اس شخص پر پڑی جو کاغذ تقسیم کر رہا تھا۔ عبدالسلام صاحب نے اسے بلایا اور اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنے لگے۔ وہ شخص اسٹیج سے اُتر جانا چاہتا تھا لیکن عبدالسلام صاحب نے اسے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالسلام مجمع سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ ان صاحب نے اس کاغذ میں لکھا ہے کہ میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا انچارج ہوں اور میرا بائیکاٹ کیا جانا چاہیے۔ میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا کسی نیوکلیر پروگرام سے کوئی تعلق نہیں ہے میرا ریسرچ سینٹر اٹلی میں ہے۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے انچارج عبدالقدیر خاں صاحب ہیں۔ یہ صاحب اس جلسے میں اس قسم کے ورقے تقسیم کر کے مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اسی کاغذ کا تیزی سے ایک گولا سا بنایا اور ان صاحب پر پھینکا اور انھیں ہال سے چلے جانے کو کہا۔ سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی کیونکہ میں نے اس وقت تک کسی مشہور و معروف ہستی کو برسرِ عام اتنا برہم نہیں دیکھا تھا۔

آج چند بیتے ہوئے واقعات یاد آئے۔ جی چاہا انھیں سپردِ قلم کردوں۔

□□□

رابطہ:
3-5-805, Hyderguda
Hyderabad-500029 (A.P.)

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت: -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری
تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت'' نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت: -/730 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

سعادت حسن منٹو　　　ہماری مطبوعات سے　　　"کلیات سعادت حسن منٹو" سے ماخوذ

ڈرپوک

میدان بالکل صاف تھا۔ مگر جاوید کا خیال تھا کہ میونسپل کمیٹی کی لالٹین جو دیوار میں گڑی ہے، اس کو گھور رہی ہے۔ بار بار وہ اس چوڑے صحن کو جس پر نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش بنا ہوا تھا، طے کر کے اس نکڑ والے مکان تک پہنچنے کا ارادہ کرتا جو دوسری عمارتوں سے بالکل الگ تھلگ تھا مگر یہ لالٹین جو مصنوعی آنکھ کی طرح ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، اس کے ارادے کو متزلزل کر دیتی اور وہ اس بڑی موری کے اس طرف ہٹ جاتا جس کو پھاند کر وہ صحن کو چند قدموں میں طے کر سکتا تھا— صرف چند قدموں میں!

جاوید کا گھر اس جگہ سے کافی دور تھا مگر وہ یہ فاصلہ، بڑی تیزی سے طے کر کے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اُس کے خیالات کی رفتار اس کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ راستے میں اس نے بہت سی چیزوں پر غور کیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بیسوا کے پاس جا رہا ہے اور اس کو اس بات کا بھی پورا شعور تھا کہ وہ کس غرض سے اس کے یہاں جانا چاہتا ہے۔

وہ عورت چاہتا تھا۔ عورت، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ عورت کی ضرورت اس کی زندگی میں یک بیک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک زمانے سے یہ ضرورت اس کے اندر آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی رہی تھی اور اب دفعتاً اس نے محسوس کیا تھا کہ عورت کے بغیر وہ ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت اس کو ضرور ملنی چاہیے، ایسی عورت جس کی ران پر ہولے سے طمانچہ مار کر وہ اس کی آواز سن سکے، ایسی عورت جس سے وہ واہیات قسم کی گفتگو کر سکے۔

جاوید پڑھا لکھا ہوش مند آدمی تھا۔ ہر بات کی اونچ نیچ سمجھتا تھا مگر اس معاملے میں مزید غور و فکر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی جو اس کے لیے نئی نہ تھی۔ عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش اس سے پہلے کئی بار اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے، انتہائی کوششوں کے بعد جب اسے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی زندگی میں سالم عورت کبھی نہیں آئے گی اور اگر اس نے اس سالم عورت کی تلاش جاری رکھی تو کسی روز وہ دیوانے کتے کی طرح، راہ چلتی عورت کو کاٹ کھائے گا۔

کاٹ کھانے کی حد تک، اپنے ارادے میں ناکام رہنے کے بعد، اب دفعتاً اس کے دل میں اس خواہش نے کروٹ بدلی تھی۔ اب کسی عورت کے بالوں میں، اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا خیال، اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ عورت کا تصور اس کے دماغ میں موجود تھا، اس کے بال بھی تھے مگر اب اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان بالوں کو وحشیوں کی طرح کھینچے، نوچے، اکھیڑے۔

اب اس کے دماغ میں سے وہ عورت نکل چکی تھی جس کے ہونٹوں پر وہ اپنے ہونٹ، اس طرح رکھنے کا آرزومند تھا جیسے تتری پھولوں پر بیٹھتی ہے۔ اب وہ ان ہونٹوں کو اپنے گرم ہونٹوں سے داغنا چاہتا تھا۔ ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا خیال بھی اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اب وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا، ایسی باتیں جو اس کے موجودہ ارادے کی طرح ننگی ہوں۔

اب سالم عورت اس کے پیش نظر نہیں تھی— وہ ایسی عورت چاہتا تھا جو کھس کھس کر شکستہ حال مرد کی شکل اختیار کر گئی ہو، ایسی عورت جو آدھی عورت ہو اور آدھی کچھ بھی نہ ہو۔

ایک زمانہ تھا جب جاوید "عورت" کہتے وقت اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کیا کرتا تھا۔ جب عورت کا تصور اسے چاند کی ٹھنڈی دنیا میں لے جاتا تھا، وہ "عورت" کہتا تھا، بڑی احتیاط سے جیسے اس کو اس

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری پروفیسر شمس الحق عثمانی کے سپرد کی گئی ہے۔ کلیات کی پہلی جلد حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جس میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ 565 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 285 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

بے جان لفظ کے ٹوٹنے کا ڈر ہو۔۔۔ایک عرصے تک وہ اس دنیا کی سیر کرتا رہا مگر انجام کار اس کو معلوم ہوا کہ عورت جس کی تمنا اس کے دل میں ہے، اس کی زندگی کا ایسا خواب ہے جو خراب معدے کے ساتھ دیکھا جائے۔

جاوید اب خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت دیر تک ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو بہلاتا رہا مگر اب اس کا جسم خوف ناک حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے تصور کی شدت نے اس کی جسمانی حسیات کی نوک پلک کچھ اس طور پر نکالی تھی کہ اب زندگی اس کے لیے سوئیوں کا بستر بن گئی، ہر خیال ایک نشتر بن گیا اور عورت اس کی نظروں میں ایسی شکل اختیار کر گئی جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

جاوید کبھی انسان تھا مگر اب انسانوں سے اسے نفرت تھی، اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا، اس طور پر کہ ایک عرصے تک اس کے خوب صورت خیال جن کو وہ اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھتا رہا تھا، غلاظت سے لتھڑے رہیں۔

''مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کردوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے، اب بدبودار اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لیے بے تاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے۔۔۔ یہ دنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے!''

نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے تھا۔ لالٹین کی بیمار روشنی میں جاوید نے جب اس فرش کی طرف، اپنی بدلی ہوئی نظروں سے، دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ بہت سی ننگی عورتیں اوندھی سیدھی لیٹی ہیں جن کی ہڈیاں جابجا ابھر رہی ہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس فرش کو طے کر کے کٹڑ والے مکان کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے اور کوٹھے پر چڑھ جائے مگر میونسپل کمیٹی کی لالٹین، غیر مختتم ٹکٹکی باندھے، اس کی طرف گھور رہی تھی۔ اس کے بڑھنے والے قدم رک گئے اور وہ بھنا سا گیا۔ ''یہ لالٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے؟۔۔۔ یہ میرے راستے میں کیوں روڑے اٹکاتی ہے؟''

وہ جانتا تھا کہ یہ محض واہمہ ہے اور اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی اس کے قدم رک جاتے تھے اور وہ اپنے دل میں تمام بھیانک ارادے لیے موری کے اس پار کھڑا رہ جاتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثے میں ملی تھی، اس لالٹین میں جمع ہوگئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پرانی کینچلی کی طرح اتار کر، وہ اپنے گھر چھوڑ آیا تھا، اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا، ایسا کھیل جو اسے کیچڑ میں لت پت کردے، اس کی روح کو ملوث کردے۔

ایک میلی کچیلی عورت اس مکان میں رہتی تھی۔ اس کے پاس چار پانچ جوان عورتیں تھیں جو رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کراتی تھیں۔ یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں۔ جاوید کو اس قحبہ خانے کے متعلق اس کے ایک دوست نے بتایا تھا جو حسن وعشق کی لاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا۔ جاوید سے وہ کہا کرتا تھا: ''تم عورت عورت پکارتے ہو۔۔۔ عورت ہے کہاں؟۔۔۔ مجھے تو اپنی زندگی میں صرف ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی۔۔۔ مستورات البتہ دیکھی ہیں اور ان کے متعلق سنا بھی ہے لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو میں نے مائی جیواں کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے۔ بخدا مائی جیواں عورت نہیں، فرشتہ ہے۔۔۔ خدا اس کو خضر کی عمر عطا فرمائے۔''

جاوید مائی جیواں اور اس کے یہاں کی چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک، ہر وقت گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ پہنے رہتی ہے اس لیے کہ کسی بیماری کے باعث، اس کی آنکھیں خراب ہو چکی ہیں۔ ایک کالی کلوٹی لونڈیا ہے جو ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ اس کے متعلق جاوید جب سوچتا تو عجیب وغریب تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی۔ ''مجھے ایسی ہی عورت چاہیے جو ہر وقت ہنستی رہے، ایسی عورتوں کو ہنستے ہی رہنا چاہیے۔۔۔جب وہ ہنستی ہوگی تو اس کے کالے کالے ہونٹ یوں کھلتے ہوں گے جیسے بدبودار گندے پانی میں میلے بلبلے بن بن کر پھٹتے ہیں۔''

مائی جیواں کے پاس ایک اور چھوکری بھی تھی جو باقاعدہ طور پر پیشہ کرانے سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب ایک برس سے وہ اس مکان میں تھی جہاں اٹھارہ برسوں سے یہی کام ہو رہا تھا۔ وہ اب پوڈر اور سرخی لگاتی تھی۔ جاوید اس کے متعلق بھی سوچتا۔۔۔ ''اس کے سرخی لگے گال بالکل داغ دار سیبوں کے مانند ہوں گے۔۔۔ جو ہر کوئی خرید سکتا ہے۔''

ان چار یا پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی۔۔۔ ''مجھے کوئی بھی مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں اور جھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھمادی جائے۔ ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے۔ کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ کوئی نرم و نازک فقرہ منہ سے نکلنے نہ پائے۔۔۔ قدموں کی چاپ سنائی دے، دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو، روپے

کھنکنائیں اور آوازیں بھی آئیں مگر منہ بند رہے، اگر آواز نکلے تو ایسی جو انسانی آواز معلوم نہ ہو۔ ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح، تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے، تھوڑی دیر کے لیے ایک ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سونگھنے، دیکھنے اور سننے کی نازک حسیات زنگ لگے استرے کے مانند کند ہو جائیں۔''

جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا، اس کی راہ میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔

اس کی بغل میں پان والے کی دکان کھلی تھی۔ تیز روشنی میں اس کی چھوٹی سی دکان کا اسباب اس قدر نمایاں ہو رہا تھا کہ بہت سی چیزیں نظر نہیں آتی تھیں۔ بجلی کے قمقمے کے اردگرد مکھیاں اس انداز سے اڑ رہی تھیں جیسے ان کے پر بوجھل ہو رہے ہیں۔ جاوید نے جب ان کی طرف دیکھا تو اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی سست رفتار چیز نظر آئے۔ اس کا کچھ کر گزرنے کا ارادہ جو وہ اپنے گھر سے لے کر یہاں آیا تھا، ان مکھیوں کے ساتھ بار بار ٹکرایا اور وہ اس کے احساس سے اس قدر پریشان ہوا کہ ایک ہلڑ سا اس کے دماغ میں مچ گیا: ''میں ڈرتا ہوں— میں خوف کھاتا ہوں— اس لالٹین سے مجھے ڈر لگتا ہے— میرے تمام ارادے اس نے تباہ کر دیے ہیں— میں ڈرپوک ہوں— میں ڈرپوک ہوں— لعنت ہو مجھ پر۔

اس نے کئی لعنتیں اپنے آپ پر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر پیدا نہ ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ نانک شاہی اینٹوں کا ناہموار فرش اس کے سامنے لیٹا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ نصف رات گزرنے پر بھی ہوا ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ بازار میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ گنتی کی صرف چند دکانیں کھلی تھیں۔ فضا خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کوٹھے سے ہوا کے گرم جھونکے کے ساتھ تھکی ہوئی موسیقی کا ایک ٹکڑا اڑ کر ادھر چلا آتا تھا اور گاڑھی خاموشی میں گھل جاتا تھا۔

جاوید کے سامنے یعنی مائی جیواں کے قحبہ خانے سے ادھر ہٹ کر، بڑے بازار میں جو دکانوں کے اوپر کوٹھوں کی ایک قطار تھی، اس میں کئی جگہ زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے بالمقابل کھڑکی میں، تیز روشنی کے قمقمے کے نیچے، ایک سیاہ فام عورت بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی، اس کے سر کے اوپر بجلی کا بلب جل رہا تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ سفید آگ کا ایک گولا ہے جو پگھل پگھل کر اس ویشیا پر گر رہا ہے۔

جاوید اس سیاہ فام عورت کے متعلق کچھ غور کرنے ہی والا تھا کہ بازار کے اس سرے سے جو اس کی آنکھوں سے اوجھل تھا، بڑے بھدے نعروں کی صورت میں چند آوازیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد، تین آدمی جھومتے جھامتے، شراب کے نشے میں چور، نمودار ہوئے۔ تینوں کے تینوں اس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور جاوید کے کانوں نے ایسی ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ کر رہ گئے۔

ایک شرابی نے جس کے قدم بہت زیادہ لڑکھڑا رہے تھے، اپنے مونچھوں بھرے ہونٹوں سے، بڑی بھدی آواز کے ساتھ، ایک بوسہ نوچ کر اس کالی ویشیا کی طرف اچھالا اور ایک ایسا فقرہ کسا کہ جاوید کی ساری ہمت پست ہو گئی۔ کوٹھے پر برقی لیمپ کی روشنی میں، اس سیاہ فام عورت کے ہونٹ ایک آبنوسی قہقہے نے وا کیے اور اس نے شرابی کے فقرے کا جواب یوں دیا جیسے ٹوکری بھر کوڑا نیچے پھینک دیا ہے۔ نیچے غیر مربوط قہقہوں کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑا اور جاوید کے دیکھتے دیکھتے وہ تینوں شرابی کوٹھے پر چڑھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نشست جہاں وہ کالی ویشیا بیٹھی تھی، خالی ہو گئی۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔ ''تم— تم— تم کیا ہو؟— میں پوچھتا ہوں، آخر تم کیا ہو— نہ تم یہ ہو، نہ تم وہ ہو— نہ تم انسان ہو نہ حیوان— تمھاری ذہانت و ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں، تمھاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا لیکن بے دھڑک اس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے، کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں— اور تم— اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے، یوں بے وقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو— تمھارا ارادہ اس قدر صاف اور شفاف ہے لیکن پھر بھی تمھارے قدم آگے نہیں بڑھتے— لعنت ہو تم پر۔''

جاوید کے اندر ایک لمحے کے لیے خود انتقامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے قدموں میں جنبش ہوئی اور موری پھاند کر وہ مائی جیواں کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سیڑھیوں کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے ایک آدمی اترا، جاوید پیچھے ہٹ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش بھی کی لیکن کوٹھے پر سے نیچے آنے والے آدمی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس آدمی نے اپنا ململ کا کرتا اتار کر کاندھے پر دھرا تھا اور داہنی کلائی میں موتیے کے پھولوں کا مسلا ہوا ہار لپٹا تھا۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور

ہورہا تھا۔ جاوید کے وجود سے بے خبر، وہ اپنے تہمد کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں تک اونچا کیے نانک شاہی اینٹوں کا اونچا نیچا فرش طے کر کے، موری کے اس پار چلا گیا اور جاوید نے سوچنا شروع کیا کہ اس آدمی نے اُس کی طرف کیوں نہیں دیکھا؟

اس دوران میں اس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو وہ اسے یہ کہتی معلوم ہوئی: ''تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو۔۔۔ یاد ہے تمھیں، پچھلے برس برسات میں جب تم نے اس ہندو لڑکی اندرا سے، اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا تو تمھارے جسم میں سکت تک نہیں رہی تھی۔ کیسے کیسے بھیانک خیال تمھارے دماغ میں پیدا ہوئے تھے۔۔۔ یاد ہے تم نے ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی سوچا تھا اور ڈر گئے تھے۔ اس لڑکی کو تم نے اسی ڈر کے مارے بھلا دیا اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کرسکے کہ وہ تمھاری رشتے دار تھی اور تمھیں اس بات کا خوف تھا کہ تمھاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے واہمے تمھارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔۔۔ اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنا چاہی مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر، تمھارے سب ارادے غائب ہوگئے اور تمھارا دل ویسے کا ویسے بنجر رہا۔۔۔ کیا تمھیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے، اپنی بے لوث محبت کو، آپ ہی شک کی نظروں سے دیکھا ہے۔ تمھیں اس بات کا کبھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمھاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے۔۔۔ تم ہمیشہ ڈرتے ہو۔ اس وقت بھی تم خائف ہو، یہاں گھریلو عورتوں اور لڑکیوں کا سوال نہیں، ہندو مسلم فساد کا بھی اس جگہ کوئی خدشہ نہیں لیکن اس کے باوجود، تم کبھی اس کوٹھے پر نہیں جاسکو گے۔۔۔ میں دیکھوں گی، تم کس طرح اوپر جاتے ہو۔''

جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا وہ واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے۔۔۔ بیتے ہوئے واقعات، تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح، اس کے دماغ میں دیر تک پھڑپھڑاتے رہے اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک ایسی جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابل رحم حد تک ڈرپوک بنادیا ہے۔

سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ وہی عورت جو گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک پہنتی تھی اور جس کے متعلق وہ کئی بار اپنے دوست سے سن چکا تھا، سیڑھیوں کے اختتامی چبوترے پر کھڑی تھی۔ جاوید گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ آگے سرک جائے کہ اس نے بڑے بھدے طریقے پر اسے آواز دی: ''اجی ٹھہر جاؤ۔۔۔ میری جان گھبراؤ نہیں۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔'' اس کے بعد اس نے پچکارتے ہوئے کہا: ''چلے آؤ۔۔۔ آجاؤ۔''

یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ میں دم اگ آئے گی جو اس ویشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کردے گی۔ اس احساس سمیت، اس نے چبوترے کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مائی جیواں کے قحبہ خانے کی اس عینک چڑھی لونڈیا نے کچھ اس طرح اپنے بالائی جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کے مانند جھڑ گئے۔ اس نے پھر پچکارا: ''آؤ۔۔۔ میری جان اب آ بھی جاؤ۔''

جاوید اٹھ بھاگا۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔

جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتاً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا جس نے اس کو تسکین دی: ''جاوید! تم ایک بڑے گناہ سے بچ گئے، خدا کا شکر بجا لاؤ۔''

□□□

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش فرش فکر شاعر تھے انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بہ زبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آنے پر آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

تحریر: ڈی.ڈی. کوسمبی
ترجمہ: بالمکند عرش ملسیانی

ہماری مطبوعات سے

''قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں'' سے ماخوذ

اشوک اور سلطنت مگدھ کی معراج

اسوک (سنسکرت میں اشوک یعنی ''بے غم'') بندو سار کا بیٹا اور چندر گپت موریہ کا پوتا تختِ شہنشاہی پر 270 ق.م. میں متمکن ہوا۔ اس کے اپنے فرمان ہندوستان کے ان قدیم ترین کتبوں میں سے ہیں جنھیں پڑھا جا سکا ہے۔ اس کی زندگی چند منتشر تفصیلات جو نیم اساطیری صورت میں محفوظ ہیں بمشکل ہی اس قابل ہیں کہ انھیں ایک تذکرے کی حیثیت سے جمع کیا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اشوک نے تخت پر بیٹھنے کی غرض سے اپنے سوتیلے بھائیوں کو قتل کیا اور اپنے دورِ حکومت میں جو چھتیس سال سے کم مدت پر محیط نہ تھا ابتدائی آٹھ سال تک بڑی مطلق العنانہ سختی سے حکومت کی۔ وہ مقام جہاں اس نے خاص طور پر قیدیوں کی اذیت رسانی کے لیے ایک روایتی ''دوزخِ ارضی'' بنایا تھا پٹنہ کے نزدیک سیاحوں کو صدیوں بعد تک دکھایا جاتا تھا۔ اس ارضی ''دوزخ'' سے محض مگدھ کے جیلوں کی عام سختیوں کی طرف اشارہ ہے جہاں سخت مشقت میں عقوبت و اذیت کا اضافہ اس وقت کیا جاتا تھا جب ایک ایسا مجرم جس کا جرم شک وشبہ سے بالاتر ہوتا تھا انتہائی ضدی یا سرکش ثابت ہوتا تھا۔ اذیت رسانی کا رواج جاگیرداری دور کے آغاز میں ختم ہو گیا تھا مگر بعد میں پھر نمودار ہو گیا۔ مختلف بیانات میں دو اشوکوں کے درمیان ایک خلط مبحث پایا جاتا ہے کیونکہ مگدھ کا ایک راجہ پانچویں صدی ق.م. میں ہوا ہے جس کے سکوں پر کھدا ہوا اس کا ذاتی نشان تقریباً وہی ہے جو دو سو سال بعد اشوک اعظم کا تھا۔ دونوں طرح کے سکے دوسرے اشوک کے عہد میں اور اس کے بعد بھی جاری رہے اس لیے ششوناگ راجہ کو فطری طور پر کالا سوک ''قدیم اسوک'' کہتے تھے۔ موریہ اسوک اپنے آپ کو پیادسی ''(حسین صورت)'' دیوتاؤں کا محبوب کہتا تھا۔ مؤخر الذکر لقب (دیوانمپیا) راجاؤں کا عام لقب تھا لیکن اس میں بادشاہت کے خداداد حق کا کوئی مفہوم مضمر نہ تھا کیونکہ یہ لفظ ''سادہ لوح'' ''یا نیم دیوانہ'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ نقش کردہ قدیم فرامین کس بادشاہ کے تھے؟ اس کا اس وقت فیصلہ ہوا جب اسی طرح کے اور کتبے مسکی (ریاست میسور) اور گجرا کے مقامات پر دریافت ہوئے جن میں صاف طور پر نام کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیادسی کا مطلب اشوک ہی ہے۔ بدھ محفوظات میں (جو سنسکرت، پالی اور چینی زبانوں میں ہیں) یہ نام اگرچہ اساطیری حیثیت رکھتا ہے لیکن سمراٹھ کے بدھ مذہب قبول کرنے اور ''سنگھ'' کو فراخدلی سے عطیات دینے کی وجہ سے زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔ اس عظیم شہنشاہ کے سکے ابھی حال تک پہچانے نہیں جا سکے تھے کیونکہ ان پر نہ کوئی نام اور نہ کوئی اساطیری حوالہ بلکہ ٹھپے کے نشان والے تمام سکوں کی طرح صرف علامات موجود ہیں۔

اشوک نے اپنی تاج پوشی کے آٹھ سال بعد یعنی کلنگ (اڑیسہ) کی تباہ کن مہم کے بعد اپنے ذہنی انقلاب کا خود بھی تذکرہ کیا ہے۔ ایک لاکھ آدمی لڑائی میں مارے گئے اور اس سے کئی گنا زیادہ جنگی لوازم کی نذر ہو گئے۔ ڈیڑھ لاکھ کو وطن سے خارج کر دیا گیا۔ یہاں خارج کے لیے وہی فعل ''اپوہ'' استعمال کیا گیا ہے ''ارتھ شاستر میں لوگوں کو زبردستی وطن سے نکال کر شاہی اراضیات پر بسانے کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ یہ فتح موریہ خاندان کے لیے بڑے پیمانے کی جنگ وجدل کا آخری کارنامہ تھا۔ کلنگ کے لوگ جو تھوڑے بہت بچ گئے تھے وہ اس کے بعد اشوک کی خصوصی حفاظت میں اس طرح آ گئے جیسے وہ اس کے بچے ہوں۔ تقریباً یہی وہ وقت تھا جب اشوک نے مگدھ کے مذہبی معلموں اپدیشوں کو سننا شروع کیا اور خود بدھ دھرم قبول کر لیا۔ اشوک کی تبدیلی مذہب کا مقابلہ اکثر 325 میں روم کے شہنشاہ قسطنطین کے قبولِ عیسائیت سے کیا جاتا ہے لیکن اشوک کی مذہبی تبدیلی نے نہ تو کوئی ایسی منظم

ہندوستان کی تہذیب و ثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی۔ڈی۔ کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی و ترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ 319 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/73 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

(کلیسائیت) پیدا کی جو ریاست سے وابستہ ہو اور نہ اس نے ہندوستان کے دوسرے مذہبوں کو اس طرح ختم کیا جس طرح سرکاری مسیحیت نے روما کی سلطنت سے غیر اہلِ کتاب کے ''کفر'' کو صفایا کر دیا تھا اس کے برعکس اشوک اور اس کے جانشینوں نے برہموں، جینیوں اور آجیوکوں کو فراخ دلی سے عطیات دیے۔ اس عظیم راجہ نے اپنی سلطنت کے ان بوڑھے آدمیوں سے ملنا ایک دستور بنا لیا تھا جو عزت و تعظیم کے مستحق تھے۔ وہ ہر قسم کے برہموں اور تپسیا کرنے والوں سے اپنے معائنے کے مستقل دوروں میں ملاقات کرتا تھا اور روپیہ اور تحائف سے مستحقین کی مدد کرتا تھا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔ بنیادی تبدیلی کا تعلق مذہب سے اس قدر زیادہ نہ تھا جتنا کہ شہنشاہ کے اس طرزِ عمل سے جو ایک مطلق العنان ہندوستانی حکمران نے پہلی بار اپنی رعایا کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ ''میں جو کچھ بھی مشقت کرتا ہوں وہ اس جدو جہد کے لیے ہوتی ہے کہ اس قرض کو ادا کروں جو تمام زندہ مخلوق کا مجھ پر ہے۔'' یہ واقعی بادشاہت کا ایک حیرت ناک حد تک نیا اور روح آفریں نظریہ تھا اور اس سے قبل کے مگدھ فنِ مملکداری میں جہاں راجہ ریاست کی مطلق العنان طاقت کا نشان تھا۔ اس نظریے کی حیثیت ایک مکمل اجنبی کی تھی۔ ارتھ شاستر کا راجہ کسی چیز کے لیے بھی کسی کا مقروض نہیں تھا، اس کا واحد کام ریاست کی منفعت کے لیے حکومت کرنا تھا اور اس سلسلے میں کارکردگی ہی اس کا واحد آخری معیار تھی۔ چھٹی صدی کے مگدھی مذاہب میں جس سماجی فلسفہ کا اظہار کیا گیا تھا وہ آخر کار اشوک کے عہد میں ریاست کے ساتھ میں داخل ہو گیا تھا۔

ان امور کے مدِ نظر اشوک پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرمانوں کی اشاعت صرف بدھ دھرم کی ترقی و تبلیغ کے لیے کی۔ اس نقطۂ نظر کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے تمام مذہبی دستوروں کی کھلم کھلا حمایت کی جاتی تھی جس میں اگر ایک طرف برہمن شامل تھے جن کی بلند و عادی کی پول بدھ مت کھولتا تھا تو دوسری طرف دو متوازی بڑے فرقے جین اور آجیوک تھے جن پر بدھ مذہب کے تمام پیروکار پوری مذہبی شدت سے لعنت بھیجتے تھے۔ بہر حال یہ درست ہے کہ راجہ خود کو بدھ دھرم کا پرستار مانتا تھا۔ اسے بدھ کی راکھ پر بے شمار استوپ اور مقدس مقامات پر دوسری یادگاریں بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ بڑی حد تک اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ستون یا پتھر پر اس کے فرمان اس زمانے کے بڑے تجارتی راستوں کے اہم چوراہوں پر یا نظم و نسق کے نئے مراکز کے قریب لگا دیے گئے تھے۔ جو کتبے ان مقامات پر لگائے گئے تھے جن کا تعلق بدھ کی زندگی کے اہم واقعات سے ہے وہ بھی زیادہ تر پرانے ''اترا پتھ'' پر تھے جو کسی زمانے میں ایک تجارتی راستہ تھا مگر وادیٔ گنگا کی آبادی کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی وقعت کے باعث بتدریج فراموش ہوتا چلا گیا۔ فرقہ بندیوں سے متعلق ایک خاص زمان میں ''بودھ سنگھ'' کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں بھکشوؤں کو کوئی خاص حقوق نہیں دیے گئے۔ صرف تعلیم اور طرزِ عمل کے باب میں بہت اچھی نصیحت کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ''سنگھ'' تیزی سے بڑھنے اور زیادہ بلند سرپرستی حاصل کرنے کی وجہ سے قدرے سست ہوتا جا رہا تھا۔

تیسری ''بدھ سبھا'' جو روایتاً اشوک کے زمانے میں منعقد ہوئی ایک تاریخی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال ان مبلغین کا ہے جو اس نے ہمسایہ ملکوں مثلاً سیلون، وسط ایشیا، اور غالباً چین بھیجے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پالی زبان میں بدھ مت کے ضوابط کا وہ قدیم ترین نسخہ جو اب تک موجود ہے بدھ کی موت کے فوراً بعد ہی مرتب کیا گیا تھا لیکن سب سے زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس کا موجودہ مواد اشوک کے عہد میں یا اس کے قریبی زمانے میں فراہم کیا گیا۔ یہ نسخہ سیلون، برما اور تھائی لینڈ میں موجود ہے۔

اشوک کے فرمان بدھ مت کے متعلق ذاتی پسندیدگی سے آگے بڑھ کر بہت دور گہرائیوں تک جاتے ہیں کیونکہ وہ ریاست کے لیے ایک کلی طور پر تبدیل شدہ بنیادی حکمتِ عملی کا مظہر ہیں۔ اس چیز کا پہلا بڑا اظہار (استوپوں سے قطعِ نظر) عوامی تعمیرات سے ہوتا ہے جن سے ریاست کو کوئی آمدنی نہیں ہوئی تھی۔ پاٹلی پتر میں اشوک کا عالی شان نیا محل اور اسی طرح کی عمارتیں آسائش اور نمائش کے لیے تھیں جیسی کہ کوئی بھی دوسرا راجہ تعمیر کر سکتا تھا۔ ''ارتھ شاستر'' کا محل اس کی بہ نسبت رہائش و حفاظت کے لیے زیادہ تھا اور اس میں لکڑی کا کام تھا لیکن اشوک نے اس کے بجائے بہت بڑی مقدار میں پتھر لگایا جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ آئینے کی طرح صاف کیا گیا تھا خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صفائی، یہ طرزِ تعمیر اور اشوک کے ستونوں کا گھنٹہ نما بالائی حصہ جو بعد میں عام طور پر ہندوستانی ستونوں میں استعمال کیا گیا رہائشی تعمیرات سے ماخوذ ہے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ دار اوّل کے ''اپدن محل'' کے نمونے پر ہی اشوک نے اپنا محل بنایا اور وہیں سے کاری گر بھی آئے چونکہ دار اوّل کا محل 500ق.م. میں دو ہزار میل سے بھی زیادہ فاصلہ پر تعمیر ہوا تھا اور سکندر کی رنگ رلیوں کے دوران 330ق.م. میں نذرِ آتش بھی کر دیا گیا تھا اس لیے اس بیان پر لفظ بلفظ یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اشوک کے زمانے کا آرٹ جس میں قدرے بعد کی تعمیر ہونے کے باوجود سانچی کے عظیم دروازوں کو بھی شامل کیے لیتا ہوں واضح طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک کافی ترقی یافتہ روایتی چوبی کام کو

براہِ راست پتھر کے کام میں منتقل کیا گیا ہے۔ کارلے کو ندانے اور دوسری گپھاؤں کے وہاروں میں منبت کاری کے نمونے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کئی کئی منزلوں والے مکان اکثر لکڑی کے ہوتے تھے حتیٰ کہ امتیازی خصوصیت والی ''بدھ محراب'' بھی اوّل اوّل لکڑی کی تھی۔ اواخر موریہ عہد کے بنے ہوئے دربارِ عام میں جس کو کسی زمانے میں غلطی سے اشوک کا عظیم محل سمجھا جاتا تھا اور جس کے کھنڈر پٹنہ کے مضافات میں کمرہر کے مقام پر کھود کر نکالے جاچکے ہیں۔ فرش اندر اور باہر کی چھت زیریں حصہ حتیٰ کہ نالیاں تک بھاری لکڑی کی تھیں۔ اس کے پالش کیے ہوئے خوب صورت پتھر کے ستون لکڑی کے بھاری لٹھوں پر قائم تھے جو زمین میں چکنی مٹی کی ایک موٹی تہہ کے اوپر عموداً گڑے ہوئے ہیں لکڑی کی اس علاقے میں بہتات تھی جو افسوس ہے کہ آج کل درختوں سے بالکل خالی ہے کیونکہ درختوں کے چھلے ہوئے لٹھوں سے بنی ہوئی سڑکیں ساتویں صدی عیسوی میں بھی بہار میں میلوں لمبی تھیں۔ پٹنہ جب اپنی پوری عظمت پر تھا تو اس کے دفاعی استحکامات بھی مٹی سے ڈھکی ہوئی لکڑی کے ہی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا آرٹ اور فنِ تعمیر جو ہندوستانی ثقافت کا کوئی سب سے کم قیمتی حصہ نہیں۔ وادیِ سندھ کی تعمیرات کے باوجود اشوک کے عہد میں شروع ہوا۔ پٹنہ کے مقام پر اشوک کے محل کے کھنڈر 400 میں بھی چینی یاتریوں کو متاثر کرتے تھے اور جنات یا مافوق الفطرت طاقت کا کام معلوم ہوتے تھے اشوک نے اس سے کہیں زیادہ اہم عوامی تعمیرات پر بہت کچھ صرف کیا جن سے ریاست کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ آدمیوں اور حیوانات کے لیے ساری مملکت میں شفا خانے بنائے گئے جہاں ریاست کے خرچ پر علاج ہوتا تھا۔ سایہ دار درختوں کے جھنڈ، کنوئیں جن میں سیڑھیاں پانی تک جاتی تھیں، میووں کے باغات اور آرام گاہیں تمام بڑے تجارتی راستوں پر بڑے اہتمام سے ایک ''یوجن'' کے فاصلے پر بنائی گئی۔ (یوجن ۔ پانچ سے نو میل تک کا فاصلہ) اصل لفظ کے معنی ہیں وہ فاصلہ جہاں تک لمبے سفر میں گاڑی کے بیل ایک بار جوتنے اور کھولنے کے درمیان آرام سے چل سکیں) یہ نئی تعمیرات تاجروں کے لیے یقیناً خداداد نعمت ثابت ہوئی ہوں گی خصوصاً اس لیے کہ انسانوں اور حیوانوں کے معالج بہت سی منزلوں پر مہیا رہتے تھے لیکن یہ صرف اشوک کی سلطنت کے اندر ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی سرحدوں کے باہر بھی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک کریم النفس ''چکرورتن'' شہنشاہ کے ان فرائض کے عین مطابق ہے جو بدھ کے ان ملفوظات میں بیان کیے گئے ہیں جن کا ذکر ایک پہلے باب میں آچکا ہے۔ ''ارتھ شاستر'' میں اس قسم کی تعمیرات کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ جب تک کہ صرف شدہ رقم کا کچھ نقد نفع نہ ملے اگرچہ یہ بے حس و خوفناک کتاب بھی بوڑھوں۔ اپاہجوں اور یتیموں کی مدد کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ راجہ اسوک پاکیزہ، نیک افعال اور مخیرانہ اشغال کی خاطر انتظامیہ، معاملات سے غفلت کرتا تھا۔ اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ باقاعدہ پابندی کے ساتھ امورِ مملکت کے متعلق اطلاعات حاصل کرنا کچھ عرصہ سے شاہی معمولات سے خارج ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ چندر گپت کی وسیع فوجی مہمات۔ بچے کھچے دشمنوں کا صفایا کرنے کے لیے بندوسار کی مسلسل عملی معروفیات اور پورے تحتی براعظم پر سلطنت کی توسیع کے مدِّ نظر ایسا ہونا ایک فطری بات بھی تھی۔ اشوک کہتا ہے کہ میں ہر وقت سرکاری رپورٹیں وصول کروں گا اور ان پر غور کروں گا۔ کھانے کے وقت رنداس میں، بستر پر، نہاتے ہوئے، فوجی پریڈ کا معائنہ کرتے ہوئے، شاہی پارک میں یا کسی اور جگہ لوگوں کی حالت کے متعلق رپورٹیں مجھ تک آنا چاہئیں۔''' ارتھ شاستر'' کا بھولا ہوا شاہی نظامِ اوقات اب بحال کیا جارہا تھا اور اس خصوصی کوشش کے ساتھ جو وقت ضائع ہوا ہے اسے پورا کیا جائے۔ لیکن چانکیہ کے نظامِ سلطنت میں شدید تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ غیر مصدقہ روایات کے مطابق چانکیہ بندوسار کی حکومت کے آغاز میں سبکدوش ہوگیا تھا) اب ہر پانچ سال کے بعد راجہ خود اپنی پوری سلطنت میں معائنے کے لیے دورہ کرتا تھا۔ اس طرح کے دورے میں لازمی طور پر پانچ سال کی مدت کا بیشتر حصہ صرف ہو جاتا ہوگا جس کے معنی یہ ہیں بارش کے زمانے کے سوا مستقل سفر رہتا تھا۔ سابقہ زمانے میں اس قسم کے تمام شاہی سفر ذاتی تفریح مثلاً شکار کے لیے یا فوجی مہموں کے لیے ہوتے تھے۔ اسی طرح انتظامیہ کے ہر ایک اعلا افسر کو یہ حکم تھا کہ وہ اپنے حلقۂ اختیار کے پورے علاقے میں پانچ سال کے بعد دورہ کرے۔ اس کے علاوہ ایک نئی جماعت اعلا اختیارات والے ناظروں کی تخلیق کی گئی تھی جن کو سرکاری عہدے داروں اور خاص مصارف پر اختیار حاصل تھا۔ اس عہدے کا نام ''دھرم مہاماتر'' تھا جس کا ترجمہ ''وزیرِ اخلاق'' ہوسکتا ہے اور بعد میں یہی نام ''خیرات اور امورِ مذہبی کا مہتمم اعلا'' ہوگیا۔ اشوک کے زمانے میں اس کا صحیح ترجمہ ''ناظرِ اعلا برائے عدل'' تھا۔ عدل وہ اصول ہے جو باضابطہ دستور و قوانین اور عام قوانین سے ماورا ہوتا ہے اور جس پر قانون اور انصاف دونوں کی بنیاد بھی جاتی ہے یہ مفہوم ٹھیک وہی ہے جو ابتدا میں لفظ ''دھمک'' کا تھا اور منیذر نے ''دھمک'' کا جو یونانی ترجمہ ''ڈکے اوسی'' کیا ہے اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ نئے ناظرِ اعلا کے فرائض کا ایک حصہ یہ تھا کہ قانون

پر عمل کرنے والی جماعتوں اور فرقوں کی شکایتوں کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ ان کے ساتھ منصفانہ سلوک ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس طرح کی تمام جماعتوں اور فرقوں کے اصول و عقائد کا پتہ بھی لگائے۔ راجہ اس کام کو خود بھی اپنے معائنے کے دوران پورا کرتا تھا۔ قدیم جماعتی قانون اور قدیم جماعتی مذہب کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ''ارتھ شاستر'' کے جن پدوں کے لوگ خصوصاً دیہاتی یقینی طور پر ابتدائی اور قدیم نوعیت کے تھے۔ ان لوگوں میں اوّلین قلبہ رانی سے لے کر غلّہ کی صفائی کے آخری عمل تک زراعت کے ہر مرحلہ پر چند مذہبی رسوم کی ادائیگی افتتاحیہ تقریب کے طور پر (اب کی طرح تب بھی) نہایت لازمی خیال کی جاتی تھی اور ان کے بہت سے رواج ایسے تھے جو قدیم خوراک جمع کرنے والے سماج سے ورثے میں ملے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان محدود مقامی اور بعض اوقات متضاد عقائد کو ایک غذا پیدا کرنے والے وسیع تر سماج سے ہم آہنگ کیا جائے یہی نصب العین بدھ مت کا بھی تھا۔ لیکن اس نے اگنی قربانی اور ہر قسم کی رسمی قربانی کی مذمت کی جب کہ اس کے برعکس ''ارتھ شاستر'' نے ''یگیہ'' سے چشم پوشی اختیار کر لی اور ''جن پد'' کو مختلف آفات مثلاً سانپوں، چوہوں یا وبائی امراض سے صاف کرنے کے لیے جادو کا استعمال کیا۔

اشوک نے تمام اقسام کی ہتیا کی ممانعت نہیں کی تھی۔ صرف ایک فہرست ایسے جانوروں اور پرندوں کی تھی جو ''محفوظ'' قرار دے گئے تھے۔ ایسا کن وجوہ سے کیا گیا یہ معلوم نہیں۔ شاید جانور کسی نہ کسی قبیلے، فرقے یا مذہب کی مخصوص علامت تھے بیل، گائے اور سانڈ اس محفوظ فہرست میں نہیں ہیں۔ صرف ''سنڈک سانڈ'' اس میں شامل ہے جس کو حسب مرضی چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا (آج بھی ایسا ہوتا ہے) اور جو افزائش نسل کے لیے بھی وہ مفید تھا اگرچہ اسے مقدّس سمجھا جاتا تھا گائے کا گوشت ابھی تک بازار میں اور چوراہوں پر کسی بھی دوسرے گوشت کی طرح کھلے بندوں بکتا تھا۔ راجہ نے خود اپنے محل میں نباتات خوری کی مثال کو قائم کیا اور شاہی گھرانے میں گوشت کے خرچ کو قریب قریب ختم کر دیا۔ یگیہ سرکاری فرمان کے تحت ممنوع قرار دیا گیا۔ اسی طرح چند خاص قسم کی تقریبات عیش و نشاط پر پابندی لگا دی گئی جن میں ادھا دھند شراب پی جاتی اور برسرِ عام بدمستیاں کی جاتیں اور ان کے نتیجہ میں یا تو جرم سرزد ہوتے یا قابلِ افسوس زیادتیاں ہوتیں۔ ہولی کا بہار یہ تیوہار جس کی انتہائی فحش خصوصیات میں قانون اور رائے عامہ نے تخفیف کر دی ہے۔ اس بات کی مکمل ممانعت تھی کہ جنگلوں میں آگ لگا کر وہاں سے جانوروں کو ذبیحہ کے لیے باہر نکالا جائے یا اس طرح زمین کو صاف کیا جائے۔

یہ کوئی بدھ دھرم کی ترنگ نہیں تھی بلکہ بستیوں کی حفاظت اور قدرتی وسائل کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کرنا قطعی ضروری تھا۔ برہمنیت کی ترجمان ''مہا بھارت'' کے ایک بعد کے اضافے میں بھی مرتے ہوئے بھیشم کی زبان سے یہی امتناعی حکم ادا کرایا گیا ہے جو جنگلوں کے جلانے کو مہا پاپ قرار دیتا ہے۔ اسی رزم نامے کے فتح مند ہیرو پانڈوں نے کرشن دیوتا کی مدد سے اسی طرح دہلی کے علاقے کو صاف کیا تھا۔ اس لیے اس سیاق و سباق میں یہ نصیحت بے تکی اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ قدیم ویدک آریائی طرز زندگی اب اس طرح گزر گیا تھا کہ دوبارہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ سماج حتمی طور پر غذائی پیداوار کے زراعت پیشہ دور میں منتقل ہو چکا تھا اور چوپائی دور کے نسبتاً ناشائستہ رواج اب حالات کے موافق نہیں تھے۔ ناظرینِ عدل کو یہ حکم تھا کہ قیدیوں کی فلاح و بہبود کا خصوصی خیال رکھیں۔ جو مجرم میعادِ قید گزرنے کے بعد بھی بیڑیوں میں رکھے جاتے ہوں ان کو رہا کر دیا جائے جیل میں کچھ قیدی ایسے تھے جن کے متوسّلین معذور تھے نئے ناظروں کو حکم تھا کہ انھیں جیل سے آزاد کرانے میں مدد دیں۔ جن قیدیوں کو موت کی سزا دی جاتی تھی ان کو تین فاضل دن اپنے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے دیے جاتے تھے لیکن سزائے موت کو ختم کر دینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اشوک کے فرمانوں میں واضح طور پر حکمراں پر اوّلین دستوری پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اس طرح ان کو شہریوں کا اوّلین ''حقوق نامہ'' کہہ سکتے ہیں۔ اس چیز کی وضاحت عہدے داران کو دی گئی ملازموں کو اس خصوصی ہدایت سے ہوتی ہے کہ بڑے بڑے عوامی اجتماعات میں کم سے کم سال میں تین بار یہ فرمان پڑھ کر سنائے جائیں اور ان کی اچھی طرح وضاحت کی جائے اب مختصر طور پر اس سوال پر غور کرنا ہے کہ اس غیر معمولی تبدیلی کی کیا ضرورت تھی؟

مقدار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انجام کار نوعیت و ماہیت کی تبدیلی کیسے عمل میں لائی جائے اس کی ایک اچھی مثال اشوک کی اصلاحات ہیں۔ گرہستی، لوگوں، کسانوں اور دستکاروں کی تعداد اور جن پدوں کی وسعت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ مالیانے کے شاہی محاسب (''رجوک'') کا عمل اقتدار کئی لاکھ نفوس پر ہونے لگا تھا ٹھیک جس طرح برطانوی دور میں ضلع کے ایک کلکٹر کا ہوتا تھا ''جن پدوں'' کے حدود اب ایک دوسرے سے بہت دور دور فاصلے پر نہیں تھے اور نہ تجارتی راستے اب گھنے جنگلوں میں تنگ پگ ڈنڈیوں کی شکل رکھتے تھے۔ جنگل کے وحشی جواب نسبتاً کم تھے۔ محض ایک ''معمولی پریشانی'' بنتے جا رہے تھے لیکن کسی قسم کا حقیقی ''خطرہ'' نہیں تھے۔ اشوک نے ان کے پاس اپنے ''دھم'' پیغام بر اسی طرح بھیجے جس طرح ان ملکوں کو جو اس کی سرحد

کے پار تھے۔ جنگل کی زمین میں جہاں حوصلہ مند افراد روز افزوں تعداد میں گھستے جا رہے تھے بہت سے صاف قطعات پیدا ہوئے جو زیر کاشت تھے اور جن کے باب میں یہ تفریق مشکل تھی کہ وہ ''راشٹر'' تھے یا ''ستا''۔ مگدھ کی کثیر و بے پناہ فوج ضرورت سے زیادہ تھی اور اس پر اس قدر زیادہ خرچ پڑتا تھا کہ سابقہ پیمانے پر اس کو قائم رکھنا ممکن نہ تھا۔ واقعتاً اشوک خود کہتا ہے کہ اس کی ''حکومتِ عدل'' کے بعد فوج محض قواعد کرنے اور عوامی نمائش کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔

ملک تین حصوں میں منقسم تھا جن کی ساخت بالکل مختلف تھی۔ اول پنجاب اور سلطنت کا غربی حصہ جس پر ہر وقت حملہ ہو سکتا تھا اور اس لیے اس کے واسطے ایک مستعد فوج کی ضرورت تھی جو ایک یا زیادہ مقامی سالاروں کے تحت رکھی جائے مقامی سالار کو فطری طور پر یہ ترغیب ہو سکتی تھی کہ خود اپنی طرف سے کسی کو راجہ بنائے یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یونانی، سک، اور دوسرے وسط ایشیائی لوگ اسے نکال باہر کریں۔ یہ دونوں باتیں اشوک سے پچاس سال کے بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ دوئم وادی گنگا کا علاقہ جو ملک کے وسط میں تھا۔ اس کو کسی فوج کی اس وقت تک ضرورت نہ تھی جب تک پنجاب پر کسی دشمن کا قبضہ نہ ہو۔ یہ اب بھی بہت ترقی پذیر اور دولت مند علاقہ تھا لیکن ریاست کی دھاتوں پر اجارہ داری رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی۔ بہار میں تانبے کی کانیں گہرائی میں پانی کی سطح تک پہنچ چکی تھیں۔ وہاں کوئی پمپ نہیں تھے۔ لوہے کی اتنی مقدار کی ضرورت تھی کہ مگدھ سے مہیا نہیں ہو سکتا تھا۔ لوہے کے نئے ذخائر کا دکن میں پتہ لگایا جا چکا تھا (جیسا کہ باوری کی کہانی سے ظاہر ہوتا ہے) اور شمال کے لوگوں نے مگدھ کے حملے سے بہت قبل نجی طور پر ان کو کسی حد تک ترقی بھی دے دی تھی۔ ہندوستانی فولاد نے بہترین تلواریں سکندر کے حملے سے ایک سو یا زیادہ سال پہلے ہخامنشی (ایرانی شاہی خاندان کا نام) دربار تک کو مہیا کی تھیں۔ اعلا صاف شدہ دھات کے اس مال کی ختم نہ ہونے والی مانگ صرف اسی طرح پوری کی جا سکتی تھی کہ بہترین خام دھاتوں کے چھوٹے چھوٹے ذخیروں کا پتہ لگایا جائے جو آندھرا اور میسور کے جنگلوں میں بکھرے ہوئے ہیں جہاں مگدھ کی ریاست کو کانوں کے دریافت کرنے والوں پر اپنے سخت گیر مرکزی اختیارات کو عائد کرنا بڑا گراں قیمت ثابت ہوتا۔ اس تیسرے علاقے یعنی جزیرہ نما میں آباد کاری کا کام مگدھ کی ''ستا'' زمینوں کی طرز پر نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ بہترین قسم کی مٹی بکھرے ہوئے چھوٹے قطعات میں مرکوز تھی اور مگدھ کی مٹی سے بالکل ہی مختلف قسم کی تھی۔ مگدھ کی سلطنت کے اس تیسرے حصے کی آئندہ ترقی کے معنی ہوتے ایک مقامی آبادی مقامی زبان اور مقامی ریاستوں کی نئی بالیدگی۔ اسوک کے زمانے میں کوئی بھی دوسرا شاہی خاندان کہیں برسر حکومت نہیں تھا بلکہ پورے ہندوستان میں ان علاقوں پر جو اس کے زیرِ حکومت نہیں تھے وحشی اور نیم وحشی قبائل کا دور دورہ تھا۔ جن بادشاہوں کا نام اس نے لیا ہے وہ صرف یونانی تھے جو اس کی مغربی سرحد کے پار تھے۔ کلنگ میں بھی کسی راجہ کا ذکر نہیں کیا گیا جس کو سو سال کے اندر ہی اس کا اپنا فاتح راجہ کھارویلا نصیب ہونے والا تھا آخری بات یہ کہ جنگلوں کو صاف کرنے کے معنی تھے سیلابوں کا اضافہ اور خود مگدھ میں بھی آمدنی کی کمی۔ جہاں بہترین زمین وہی ہوتیں جو پہلے صاف ہو چکی تھیں اور باقی کی آبپاشی مشکل تھی۔ اگر سیلاب اور بارش کی قلت کے باعث ایک سال بھی خراب ہو جاتا تو ایک بڑھتے ہوئے وسیع علاقے میں سرکاری مالیانہ کا مکمل نقصان ہو جاتا اور امدادی تدابیر کی وجہ سے خزانے پر اتنا ہی مزید بوجھ پڑ جاتا۔ یہ مسئلہ ایک سخت مرکزی نظام کے ہر دیگر مسئلے کی طرح سست ذرائع نقل وحمل اور لمبے فاصلوں کی وجہ سے اور بھی مشکل تھا۔

اشوک کے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض خیالی تعبیر نو نہیں تھی۔ چندر گپت موریائی نشان والے ''کارشاپن'' سکہ کا اتنا ہی وزن ہے جتنا اس کے پیشرو کا۔ لیکن اس میں تانبے کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ۔ اس کی ساخت زیادہ بھدی اور وزن میں اتنا تنوع ہے کہ لازمی طور پر بہت جلدی میں بنایا گیا ہوگا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ کرنسی پر دباؤ زیادہ تھا اور سکوں کی مانگ کو پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سکوں کی کم قدری (پھیلاؤ) بھی تھی اور سکوں کی الٹی طرف سے وہ نشانات غائب ہو گئے تھے جو قدیم تجارتی انجمنوں کے ترجمان تھے۔ لہٰذا نئے تاجر کو کنٹرول کرنا کم آسان ہو گیا تھا دوسری طرف دکن میں کم سکوں ہی سے کام چل جاتا تھا۔ مثلاً چاندی کے زیادہ ہلکے سکے بلکہ سیسے اور جست کے ٹوکن بھی کافی ہوتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت بہت زبردست حد تک بڑھ گئی تھی اور تاجروں کو جو قبائلیوں سے مبادلہ کرتے تھے بہت بھاری منافع حاصل ہوتا تھا۔ سکے کی اوّلین کم قدری خود چانکیہ سے منسوب ہے جس نے روایتاً اتنی ہی چاندی کی مقدار سے آٹھ گنا سکے بنا ڈالے تھے لیکن جب خزانہ مشکل میں ہو تو ''ارتھ شاستر'' نے اس کے لیے دیگر تدابیر بھی بتائی ہیں۔ جس راجہ کو مالی پریشانی ہو اسے چاہیے کہ لوگوں کے سرمایے، تجارتی سامان کے ذخیروں، اناج وغیرہ پر خصوصی ٹیکس لگائے لیکن صرف ایک بار۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اور ہر جگہ حاضر رہنے والے ریاستی کارندے اس موقع پر ''رضاکارانہ'' عطیات کے ساتھ آگے بڑھیں اور اس طرح عوام کا جوش بڑھائیں۔ نئے نئے مذہبی پوجا پاٹ کے طریقے

''دریافت کیے جائیں خواہ وہ ''ناگوں'' سے تعلق رکھتے ہوں یا بھوت پریت یا اسی نوع کی دوسری چیزوں سے۔ خفیہ کارندے اس طرح ضعیف الخیال لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے چڑھاوے حاصل کریں جو خاموش و خفیہ طریقے پر خزانے میں چلے جائیں۔ کوٹلیہ جیسے برہمن وزیر کا ایسا طریقہ تجویز کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تیسری صدی تک بہت سے برہمن قدیم اور غیر ویدک توہمات کو حقارت کے ساتھ گوارا کر سکتے تھے۔ ویاکرن کا ماہر پانجلی سرسری طور پر یہ تذکرہ کرتا ہے کہ موریوں نے روپے کی خاطر اس قسم کی پوجا پاٹھ کے طریقے ایجاد کیے تھے۔ آخر میں قومی قرضہ اور سرکاری ادھار کے بجائے ''ارتھ شاستر'' نے تاجروں کے خلاف خصوصی اقدامات کی سفارش کی ہے۔ مناسب بھیس بدل کر جاسوس دولت مند تاجر کو شراب پلاتے، اسے لوٹتے۔ اس پر کسی جرم کا جھوٹا الزام لگاتے اور یہاں تک کہ اسے قتل بھی کر دیتے تاجر کا ضبط شدہ مال اور روپیہ ریاست کے خزانے میں داخل ہو جاتا تھا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ خواہ خفیہ کارندے کتنے ہی احتیاط سے چنے جاتے ہوں یہ مہلک طریقے انسانی کردار پر ایک ایسا دباؤ ڈالتے تھے جو حفاظت و سلامتی کی حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ اشوک کے مفادِ عامہ کے کام اور تعمیرات خزانہ کے بہت سے روپیہ کو واپس گردش میں لے آئیں۔ اس کے اور اس کے ملازموں کے دوروں نے نقل و حمل پر پڑنے والے دباؤ کو کم کر دیا اور مقامی فاضل پیداوار جہاں بھی ہوتی تھی وہیں کھالی جاتی تھی۔ رعایا کے ساتھ ایک نیا رویہ اور تجارتی راستوں پر نئی تعمیرات ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے ایک مضبوط طبقاتی بنیاد ریاست کے لیے قائم کر دی جس پر اب تک ضابطہ پرستی کی اور ضابطہ پرستی کے لیے حکومت ہوتی آئی تھی اشوک کے بعد ریاست نے ایک نیا کام سنبھالا یعنی طبقات کی باہمی مفاہمت— ''ارتھ شاستر'' نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور درحقیقت اراضی کی صفائی۔ اراضی کی آبادکاری اور سخت ضوابط میں جکڑی ہوئی تجارت کی جو حکمتِ عملی ریاست مگدھ میں اختیار کی گئی تھی اس کے گویا مسامات کے اندر ہی اندر سماج کے طبقات بڑھتے جا رہے تھے۔ اس مفاہمتی کارروائی کے لیے مناسب ترین ذریعے جو اختیار کیے گئے وہ ایک نئے مفہوم میں عالم گیر دھم (دھرم) تھا۔ اس تازہ بالیدہ مذہب نے راجہ اور رعایا کو ایک مقام پر جمع کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ آج یہ حل بہترین معلوم نہ ہو۔ لیکن اس وقت یہ فوراً موثر ثابت ہوا۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے قومی کردار ''دھم'' کی مہر اشوک کے زمانے میں لگی۔ جلد ہی اس لفظ کا مفہوم'' عدل کے ماسوا کچھ اور ہوگیا۔ یعنی مذہب۔ لیکن یہ کسی طرح بھی اس قسم کا مذہب نہیں تھا جس کا پیروکار خود اشوک تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے یہ روایت سی بن گئی کہ ہندوستان کی آئندہ انتہائی نمایاں ثقافتی ترقیوں پر کسی نہ کسی ''دھم'' کا گمراہ کن غلاف چڑھا رہے۔ یہ بات بالکل موزوں اور مناسب حال ہی ہے کہ ہندوستان کا موجودہ قومی نشان اشوک کے ستون کے شیر نما بالائی حصہ سے لیا گیا ہے جو تھوڑا بہت اب تک سانچی کے مقام پر باقی ہے۔

□□□

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ''حیات جاوید'' میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

کلیات چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)

ترتیب و تدوین: مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے

جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے

جلد اوّل، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے %45 اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-066 110

اردو خبر نامہ

مولانا ابوالکلام آزاد تقاریب

● حیدرآباد، 11 نومبر۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ملک کے تعلیمی نظام کو ہمہ مقصدی اور ہمہ جہت بنانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جسٹس سردار علی خاں، سابق صدر، قومی اقلیتی کمیشن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں فاؤنڈیشن لکچر سیریز کے تحت یوم آزاد کے سلسلے میں دیے گئے اپنے توسیعی لکچر "مولانا آزاد کی تعلیمی خدمات" کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے صدارت کی۔ جسٹس سردار علی خاں نے مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں بالخصوص ان کی سیاسی، سماجی، صحافتی اور تعلیمی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بھی مولانا کی فکر کارفرما تھی۔ انھوں نے ایک مشن کے طور پر متحدہ ہندوستان کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اپنی علمی، تعلیمی، صحافتی، سیاسی، سماجی خدمات کے لیے امام الہند کہلانے والے مولانا آزاد نے ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے عصری تعلیم سے ہندوستانیوں کو آراستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ نظام تعلیم میں سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے قیام کے ذریعے اس شعبے کو ہمہ تعلیمی نظام کی حیثیت سے استحکام عطا کرنے والے مولانا آزاد نے 1948 میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن قائم کیا تھا جو اس نظام کے لیے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے کئی زاویوں سے تعلیمی نظام کو استحکام عطا کیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام بھی مولانا آزاد کی دور اندیشی اور تعلیمی فکر کا نتیجہ ہے جس کے بغیر آج ہندوستان میں نظام تعلیم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جسٹس سردار علی خاں نے کہا کہ مولانا آزاد نے اساتذہ کی علمیت اور معیار کو نظام تعلیم کی کلید قرار دیتے ہوئے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن فار ٹیچر ٹریننگ کا آغاز کیا تھا تاکہ طلبہ اور اساتذہ کے رشتوں کو فروغ اور استحکام عطا کیا جا سکے۔ جسٹس سردار علی خاں نے کہا کہ مولانا نے سب سے پہلے بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ ماڈرن ایجوکیشن کا نظام پیش کرتے ہوئے بھی ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جسٹس سردار علی خاں نے مدرسوں میں بھی ماڈرن ایجوکیشن کو متعارف کروانے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ آکسفورڈ و کیمبرج یونیورسٹی جیسی قدیم جامعات میں بھی گذشتہ چھ سو ساڑھے چھ سو برس سے مذہبی تعلیم اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ جسٹس سردار علی خاں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اردو تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو کی اس عظیم جامعہ سے اقلیتوں کی ایک نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے اس موقع پر جسٹس سردار علی خاں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف بھی پیش کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر پٹھان نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے ایکٹ میں اس بات کی گنجائش فراہم کی گئی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے دوسرے اداروں کے ساتھ تعاون و اشتراک کرے لہٰذا کتب خانہ آصفیہ میں موجود اردو، عربی، فارسی اور لاطینی زبان کے علمی خزینوں کو یونیورسٹی کے مجوزہ کلچرل سنٹر (اردو میوزیم) میں منتقل کرتے ہوئے اس کے تحفظ کے امکانات کا نہ صرف یہ کہ تفصیلی جائزہ لیا جائے گا بلکہ اس پر عمل آوری کو بھی یقینی بنایا جائے گا۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد انچارج شعبۂ تعلقات عامہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس تقریب میں پروفیسر خالد سعید، ڈین و صدر شعبہ اردو، پروفیسر سید شاہ محمد مظہر الدین فاروقی، پروفیسر ایس.اے. وہاب قیصر اور تدریسی و غیر تدریسی شعبے کے اراکین کی کثیر تعداد شریک تھی۔

(ڈاک سے)

● پٹنہ، 11 نومبر۔ (اسٹاف رپورٹر)۔ مولانا آزاد اپنے افکار و نظریات، بلند پایہ اصولوں، گرانقدر ملکی و ملی خدمات اور جنگ آزادی میں اہم ترین کردار ادا کرنے کی بنیاد پر ملکی ہی نہیں بلکہ عالمی سطح کی شخصیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ باتیں مرکزی وزیر مملکت ڈاکٹر شکیل احمد نے آج انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام منعقدہ قومی یوم تعلیم کی تقریب کے افتتاح کے موقع پر کہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج مولانا آزاد کے نظریات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ وزیر موصوف نے مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو بطور "قومی یوم تعلیم" منانے کی پرزور حمایت بھی کی۔ وزیر تعمیرات حکومت بہار ڈاکٹر مناظر حسن نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے پر زور دیا اور مدارس کے ذہین طلبہ کو مختلف مسابقتی امتحانات کے لیے تیار کرنے اور انتظامی ملازمتوں

میں شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ اے۔این۔سنہا انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر سچد انند نے اپنے کلیدی خطبے میں مولانا آزاد کی سیاسی اور تعلیمی خدمات کے ساتھ ان کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر اور مشہور ماہر تعلیم پروفیسر سید حامد نے مولانا آزاد کی شخصیت کو عہد ساز قرار دیتے ہوئے کہا کہ آج اگرچہ مولانا آزاد ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و نظریات سے ہم استفادہ کرکے قوم وملت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرسکتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کے صدر پروفیسر ابوذر عثمانی نے ابتدائی سطح پر اردو تعلیم کی زبوں حالی پر تشویش کا اظہار کیا۔

فیروز بخت احمد نے مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو بطور قومی یوم تعلیم منانے پر انجمن ترقی اردو بہار کے اراکین کی ستائش کی اور کہا کہ ان کی اس شروعات نے پورے ملک کو ایک نئی فکر عطا کی۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنی تقریر میں کہا کہ مولانا آزاد نے ساری زندگی سماجی و انسانی اقدار کے تحفظ اور ترویج کی کوشش میں صرف کی۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر ایم۔او۔صدیقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں حکومت ہند سے مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو بطور یوم تعلیم اعلان کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کی تائید تمام حاضرین جلسہ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر کے جلسے کی نظامت انجمن کے جنرل سکریٹری فخرالدین عارفی نے کی۔ شکریہ کی رسم انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر نجیب اختر نے ادا کی۔ جلسے کی ابتدا میں الحرا پبلک اسکول، شاہ گنج کی بچیوں نے دلکش انداز میں اقبال کی نظم "دعا" اور "ترانۂ ہندی" پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● پٹنہ، 16 نومبر (محمد سعد اللہ/ایس۔این۔بی۔) مولانا ابوالکلام آزاد نے آج سے نصف صدی قبل جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ہمیں آج کے ہندوستان کی شکل میں نظر آرہی ہے۔ یہی وہ امر ہے جو ہمیں ان کی سیاسی بصیرت اور دوربینی کا قائل بنا دیتا ہے۔ مولانا نے ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ہندوستان کا جو خاکہ تیار کیا تھا، اس میں اب رنگ بھرتا نظر آرہا ہے اور بہت جلد ہی (2020 تک) ہم عالمی طاقتوں کے ہمسر ہوں گے۔ ان خیالات کا اظہار گورنر ہریانہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن نے خدا بخش لائبریری میں اپنے توسیعی خطبہ بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک خراج عقیدت' کے دوران کیا۔

توسیعی خطبہ کی صدارت گورنر بہار آر۔ایس۔گوئی نے کی۔ مسٹر گوئی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے۔ مسٹر آر۔ایس۔گوئی نے اعداد کاری کے سلسلہ میں منعقد ورکشاپ کی افتتاحی تقریب کی صدارت بھی کی اور مولانا آزاد سے متعلق لائبریری سے شائع ایک کتاب کی رونمائی بھی کی۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد کے شکریہ کے ساتھ تقاریب اختتام پذیر ہوئی۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

● ناگپور۔ یونائیٹڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن ناگپور کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر ایک جلسۂ عام مسلم لائبریری گراؤنڈ مومن پورہ میں منعقد کیا گیا۔

اس موقع پر منعقدہ سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے اشتراک سے ہوا۔ جس کی صدارت انجمن تعلیم المسلمین جل گاؤں کے صدر حاجی عبدالغفار ملک نے فرمائی ابتدائی کلمات یونائیٹڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن، ناگپور کے سرپرست صدیق علی خان پٹیل نے پیش کیے۔ جلسے کا افتتاح قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا قاری مسعود احمد گونڈی صاحب نے قرآن پاک کی تلاوت فرمائی۔

ہندوستان میں ٹیکنیکل اور سائنسی علوم کو فروغ دینے میں مولانا آزاد کا کردار، مولانا آزاد بحیثیت عالم دین، ان عنوانات پر فراز حامدی، ڈاکٹر الیاس صدیقی، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت غلام رسول اشرف نے کی۔ شکریے کی رسم تنظیم کے ناظم انعام الرحیم نے ادا کی۔

جلسۂ تقسیم انعامات میں مولانا آزاد کے یوم ولادت کے موقع پر منعقد کردہ آل مہاراشٹر مضمون نویسی مقابلے میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو قومی ہاکی ٹیم کے سابق کپتان وسابق مرکزی وزیر اسلم شیر خاں صاحب کے دست مبارک سے انعامات تقسیم کیے گئے۔ ہائی اسکول گروپ میں اول انعام محمد اظہر (الخیر ہائی اسکول تلے گاؤں) دوم انعام شگفتہ فردوس (انجمن ہائی اسکول محل) سوم انعام حدیقہ فردوس (ایس۔ایس۔کلن میاں انصاری ہائی اسکول، کامٹی) اور جونیئر کالج گروپ میں محمد عثمان (ایم۔اے۔کے۔آزاد جونیئر کالج اکل کواں) کو اول، ارشد سہیل (ایم۔اے۔کے۔آزاد جونیئر کالج گاندھی باغ) کو دوم اور عمران خان (جواہر اردو جونیئر کالج، موہتلا، بلڈانا) کو سوم انعام پیش کیا گیا۔

ایس۔ایس۔سی۔بورڈ کے امتحان میں میرٹ میں آنے والے حسامیہ بوائز اسکول کے طالب علم عاطر شیخ اور ہندی مراٹھی زبان مضمون میں اول مقام حاصل کرنے والی طالبہ شگفتہ صدف کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس جلسے کی نظامت محمد سعید صاحب نے بحسن وخوبی انجام دی اور شکریے کی رسم جاوید احمد انصاری نے ادا کی، مہمانوں کا استقبال عتیق قریشی نے کیا۔ (ڈاک سے)

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت 11 نومبر 2006 کو ایک روزہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت جناب اشرف ساحل، ڈائرکٹر دوردرشن چنڈی گڑھ نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، ڈاکٹر راجکمار اور ڈاکٹر چندر ترکھا نے مولانا کی تعلیمی خدمات، صحافت اور ان کے قومی یکجہتی کے تصور پر اپنے مقالے پیش کیے۔

مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے جنھوں نے ملک گیر سطح پر تعلیمی نظام کو ایک نئی شکل دی۔ جناب کشمیری لال ذاکر، ہریانہ اردو اکادمی نے اپنے تعارفی کلمات میں مختصر طور پر مولانا آزاد کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے جنگ آزادی سے متعلق ان کی مختلف میدانوں میں خدمات کا ذکر کیا۔ تقریب کی نظامت جناب شمس تبریزی نے کی۔ اس موقع پر شائقین ادب نے کثیر تعداد میں جمع ہوکر مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ (ڈاک سے)

ورکشاپ برائے پرائمری مدارس اساتذہ

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش اور انتظامیہ اردو ماڈل اسکول، حمایت نگر و مغل پورہ کے زیر اہتمام سال گذشتہ 2005 اور 2006 میں ہائی اسکول اور مڈل اسکول کے اساتذہ کے لیے ورکشاپ منعقد کیا گیا تھا۔ شریک اساتذہ نے خواہش کی تھی کہ پرائمری اساتذہ کے لیے بھی اس طرح کا ورکشاپ منعقد کیا جائے۔ چنانچہ پرائمری اسکول کے اساتذہ کے لیے پانچ مضامین کے طریق تدریس سے متعلق ورکشاپ 6 نومبر 2006 تا 10 نومبر 2006 اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد میں منعقد کیا گیا۔

اس ورکشاپ میں حیدرآباد کے کئی اردو میڈیم مدارس نے شرکت کی۔ روزانہ شریک اساتذہ کی تعداد 70 تا 80 رہی ورکشاپ میں حیدرآباد کے اردو میڈیم پرائمری اساتذہ کے علاوہ مختلف اضلاع سے بھی اساتذہ نے شرکت کی۔ پروگرام کے افتتاحی جلسے کی صدارت جناب غلام یزدانی نے کی۔ کلیدی خطبہ مہمان خصوصی جناب وہاب عندلیب نے دیا جس میں انھوں نے پرائمری سطح پر تدریس کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ معلم کو تدریس کے عام مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ (مثلاً بولنا، لکھنا، سننا، سمجھنا اور پڑھنا) صحیح تلفظ کے ساتھ خود بولیں اور بچوں کو صحیح تلفظ ادا کرنے کی مشق کروائیں۔ جناب غلام یزدانی، پروفیسر یوسف کمال، جناب محمد الحق نے پرائمری سطح پر تعلیم کی اہمیت اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔

ورک شاپ کی ابتدا انگریزی کے اسباق سے ہوئی۔ جناب عبدالماجد نے انگریزی کے طریق تدریس پر روشنی ڈالی۔ جناب فیض الرحمن نے کہا کہ اردو میڈیم اسکول میں انگریزی کی بہتر تعلیم ایک چیلنج ہے۔ اس چیلنج کو قبول کرکے آدمی کی استعداد اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کی بنا اردو میڈیم میں انگریزی تدریس کے بہترین طریقوں سے اساتذہ کو واقف کرایا۔

7 نومبر صبح 10 بجے دن اردو مضمون کے ورکشاپ کی شروعات ہوئی۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین نے بچوں کی نفسیات سے واقفیت اور تعلیم میں اس کے استعمال پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ سوالات روایتی انداز کے نہ ہوں جن سے طلبہ کی انفرادی سوچ، تخلیقی رجحان اور حقائق کو سمجھنے کی صلاحیتیں فروغ نہیں پاتیں۔ سید جاوید محی الدین نے کہا کہ بچے کی مکمل توجہ حروف اور الفاظ کی شکل پر ہونی ضروری ہے۔ مواد کو دیکھے بغیر رٹنے کا انداز الفاظ کی شناخت پیدا نہیں کرسکتا۔

ورک شاپ کا تیسرا دن ریاضی مضمون کے لیے رکھا گیا۔ جناب ایم۔اے۔منیر اور جناب خلیل احمد قادری نے۔ تحتانوی سطح پر ریاضی کی تدریس سے متعلق انتہائی عصری اور معلوماتی مواد سے واقف کرایا۔ ریاضی کے مختلف تدریسی طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ پرائمری سطح پر کون سے طریقے کارگر ہو سکتے ہیں۔ اعداد کی پہچان، اشیاء کی گنتی وغیرہ سے واقفیت کے بعد معمولی جمع تفریق کا فرق، بتایا جائے۔ پرکشش تدریسی اشیا کے ذریعے مختلف جیومٹریکل اشکال کا مشاہدہ اور ان اشکال سے مماثلت رکھنے اشیا کی پہچان ان کے حجم اور جسامت کے فرق کی پہچان کرائی جائے۔

9 نومبر کو سائنس ورکشاپ منعقد ہوئی۔ جس میں محترمہ تسلیم سلطانہ اور جناب واجد محی الدین صاحب نے سائنس کی ماہیت، سائنس پڑھانے کے عام مقاصد اور سائنس کے طریقۂ تعلیم پر اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ سائنس کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ سائنس برائے واقفیت نہیں بلکہ سائنس برائے زندگی ہو علاوہ ازیں بچوں کی ذہنیت اور عمر کے پیش نظر۔ اشیا کی پہچان کرائی جائے جو بچے کے اطراف پائی جاتی ہوں۔ جسمانی اعضا ذائقوں، پھولوں، پھلوں، ترکاریوں، پرندوں، جنگلی جانوروں، پالتو جانوروں کے ناموں اور ان کے فرق کو واضح کریں تاکہ بچہ ان چیزوں سے بخوبی واقف ہوجائے۔

10 نومبر کو 10 بجے دن سماجی علم کے طریقۂ تدریس سے متعلق جناب اقبال احمد نے سماجی علم پڑھانے کے فائدے پرائمری سطح پر اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔

انتظامیہ اردو ماڈل اسکول اور قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ اس ورکشاپ کی اختتامیہ تقریب میں ورک شاپ کے

شرکا (اساتذہ) کو اسناد عطا کی گئیں اور ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو (اے. پی.)، محترم غلام یزدانی، محترم نواب اقبال علی خاں اور ہیومن ایج اسوسایئشن کے معتمد جناب مسعود عبدالخالق (گلبرگہ) نے شرکت فرمائی۔ جناب اسلام الدین مجاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور محترمہ رضیہ سلطانہ کے شکریہ پر اس محفل کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

حضرت امیر خسرو کا 702واں عرس

نئی دہلی، 9 نومبر (ایس.این.بی.) طوطئ ہند حضرت امیر خسرو کے 702واں سالانہ عرس منعقد کیا گیا۔ پانچ روزہ عرس کے پہلے دن ہزاروں عقیدت مندوں نے حضرت امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ اس موقع پر پاکستانی زائرین کے 140 رکنی وفد نے بھی عرس کی تقریب میں شرکت کی اور نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمیشن کے آفیسر شہزاد احمد کی قیادت میں حضرت امیر خسروؒ دار حضرت نظام الدین کی درگاہ پر چادر چڑھائی۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن و امان کے فروغ میں صوفی سنتوں کا اہم کردار رہا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ ہندوستان کے ان عظیم صوفیوں میں ایک ہیں جنھوں نے ملک میں یکجہتی، محبت، بھائی چارہ اور امن کا پیغام دیا۔ ان خیالات کا اظہار آج لیفٹننٹ گورنر بی. ایل. جوشی نے حضرات امیر خسرو کے 702ویں عرس کے موقع پر عرس محل میں منعقد ایک تقریب کے دوران کیا۔ اس موقع پر خواجہ احمد نظامی، پیرزادہ سراج مدنی نظامی اور خواجہ فرید احمد نظامی بھی موجود تھے۔ مسٹر جوشی نے مزید کہا کہ حضرت امیر خسروؒ کے فارسی اور ہندی کلام نے ہندوستان کے ادب، ثقافت، معاشرے اور ہندوستانی فلاسفی کو فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت امیر خسروؒ صحیح معنی میں سچے ہندوستانی تھے۔ ان کے ہندوستانی ہونے پر ہمیں فخر ہے۔ جوشی نے کہا کہ آج ملک میں ان عظیم صوفی سنتوں کے امن، بھائی چارہ اور ہم آہنگی کے پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیفٹننٹ گورنر نے اس موقع پر صوفیانہ قوالی کا بھی لطف لیا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے درگاہ میں پاکستانی وفد کا استقبال کیا اور شہزاد احمد و دیگر زائرین کی دستار بندی کی۔ اس موقع پر ایک سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔

ہریانہ کے گورنر اخلاق الرحمن قدوائی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں دانشوروں نے شرکت کی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنی خصوصی تقریر میں امیر خسرو کی شخصیت واہمیت پر روشنی ڈالی۔

مشہور مورخ جمال الدین نے خسرو کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ان کی شاعری میں گہرائی حضرت نظام الدین کی سرپرستی کے سبب پیدا ہوئی اور انھوں نے خواص وعوام دونوں کی شاعری کی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سماجیات کے پروفیسر ریاض پنجابی نے امیر خسروؒ کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو نے ہندوستانی عوام میں باہمی میل ملاپ کو فروغ دیا۔ سید شاہد مہدی، اختر الواسع اور شریف حسین قاسمی وغیرہ نے بھی خواجہ امیر خسروؒ کی زندگی اور کمالات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر مخمور سعیدی نے اپنے کلام کے ذریعے امیر خسروؒ کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

نئے پرانے چراغ

دہلی، 13 نومبر۔ دہلی اردو اکادمی کا سہ روزہ ادبی اجتماع "نئے پرانے چراغ" غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں 10 نومبر سے 12 نومبر کے درمیان منعقد ہوا۔ اس کا افتتاح پروفیسر وہاب اشرفی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کا ادب پرانے نہیں بلکہ نئے ادیبوں کے ہاتھوں میں ہے۔ آج کی نئی نسل کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ادب کے حوالے سے کیا کچھ ہو رہا ہے اور وہ نئی تکنیک سے بھی واقف ہے۔ اس نئی نسل میں مسائل سے جدو جہد کرکے ان کا حل تلاش کرنے کی جستجو بھی موجود ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ نئی نسل، نئی فکر اور نئی سوچ کے ساتھ اپنی تہذیب وثقافت کے حوالے سے اہم کام انجام دے گی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال نے کہا کہ ہر قلم کار اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے، اس کا موازنہ کسی دوسرے دور کے قلم کار سے کرنا مناسب نہیں ہے۔

دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے پروفیسر وہاب اشرفی اور جوگندر پال کی اردو ادب کے فروغ کے لیے کی گئی خدمات کی ستائش کی۔ انھوں نے نئے پرانے چراغ کے حوالے سے کہا کہ اس سہ روزہ ادبی اجتماع کا اہم مقصد پرانی اور نئی نسل کے درمیان احترام، محبت اور اخلاص کی فضا قائم کرنا ہے جو آج کے دور میں کہیں گم ہوتی جارہی ہے۔

دوسرے دن یعنی 11 نومبر کو منعقد ہونے والے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی، جناب بلراج کومل اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی۔ نظامت ڈاکٹر اشفاق عارفی نے کی اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، ڈاکٹر رضا حیدر، راشد عزیز اور عظیم امروہوی نے تجزیے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر شریف احمد، شیخ سلیم احمد اور عمران

عظیم نے اپنے تجزیے پیش کیے۔ آخر میں محفل شعروسخن منعقد کی گئی۔

تیسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر شاہد حسین نے کی اس اجلاس میں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے پروفیسر صادق کی نظم ''حسیں کیا پتہ ہے'' خورشید اکرم نے بلقیس ظفیر الحسن کے افسانے ''ایک دن'' ڈاکٹر خالد اشرف نے شجاع خاور کی نظم ''دوسرا شجر'' ڈاکٹر خالد علوی نے صلاح الدین پرویز کی نظم ''تم سے جدا ہونے کے بعد''، ڈاکٹر عفت زریں نے شاہد ماہلی کی نظم ''خوشبو یادوں کی'' ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے پروفیسر عتیق اللہ کی غزل، شعیب رضا فاطمی نے زبیر رضوی کی نظم ''ردعمل'' اور ڈاکٹر احمد امتیاز نے منظور عثمانی کی تخلیق ''قیلولہ'' کا تجزیہ پیش کیا۔

آخری اجلاس میں پروفیسر حنیف کیفی نے فریاد آزر کی غزل، پروفیسر قمر رئیس نے شمس رمزی کی غزل، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے نگار عظیم کی کہانی ''زاہدہ مقدس'' وقار مانوی نے شہباز ندیم ضیائی کی غزل، سید ضمیر حسن دہلوی نے محمد حیدر نقوی کے افسانے، ہمایوں ظفر زیدی نے ڈاکٹر شبیر رسول کی غزل، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے ڈاکٹر تابش مہدی کی غزل، ڈاکٹر مولا بخش نے نجمی سکندر آبادی کی غزل، ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے نند کشور وکرم کی کہانی ''کابلی والا'' اور ڈاکٹر ارشاد نیازی نے بھگوان داس اعجاز کے دوہوں کا تجزیہ پیش کیا۔

نئے پرانے چراغ کے اختتامی اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور جناب اظہار اثر شامل تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس نے اعلان کیا کہ دہلی اردو اکادمی بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کی طرز پر ایک اور ایوارڈ شروع کرنے جارہی ہے جس کے تحت 51 ہزار روپے نقد اور توصیف نامہ پیش کیا جائے گا۔ اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی کے اظہار تشکر پر اس سہ روزہ ادبی تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

(''قومی آواز''، دہلی)

''کئی چاند تھے سر آسماں'' کی اشاعت

نئی دہلی، 6 دسمبر۔ پنگوئن کے اردو ایڈیٹر نوید اکبر کی اطلاع کے مطابق جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' شائع ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔ ڈیمائی سائز میں چھپے 853 صفحات کے اس ناول کی قیمت 450 روپے ہے۔ اس ناول کے دو ابواب ''شب خون'' میں، ایک باب ''ذہن جدید'' میں اور ایک باب ''مکالمہ'' میں عرصہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس ناول کے بارے میں جناب انتظار حسین نے لکھا ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ ناول اردو فارسی شاعری اور ہند اسلامی تہذیب کی مرقع نگاری کے انھی سچے رنگوں سے عبارت ہے جو ''سوار'' کے افسانوں میں ہر صفحے پر جھلکتے اور چمکتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے راجپوتانے سے شروع ہونے والی اور ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصے بعد دلی کے لال قلعے میں ختم ہونے والی یہ داستان ہند اسلامی تہذیب، ادبی معاشرے، انگریزی سیاست، اور اس کی وجہ سے تہذیب اور تاریخ کے بدلتے ہوئے پیکر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ ناول ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہند اسلامی معاشرے میں شاعر، عاشق، فنکار اور عام انسان، زندگی اور جذباتی اور روحانی تکمیل کی تلاش کس طرح اور کن اصولوں کی بنا پر کرتے تھے۔ دلی کی مٹتی ہوئی بادشاہت کے سائے میں پھلنے پھولنے والی اس تہذیب کا منظرنامہ غالب، ذوق، داغ، گھنشیام لال عاصی، امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ بہت سے حقیقی کرداروں سے جگمگا رہا ہے۔''

یہ ناول پاکستان میں پہلے ہی شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی تعارفی تقریب بھی کراچی میں منعقد ہوئی جس کا اہتمام گلشن گروپ نے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت سید مظہر جمیل نے انجام دی۔ صبا اکرام نے تعارفی کلمات میں کہا کہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اردو ناول کا معیار اور صورت کیا ہونی چاہیے، ''کئی چاند تھے سر آسماں'' انھی سوالوں کے جواب لے کر سامنے آیا ہے۔ مبین مرزا نے کہا کہ یہ ناول سوال اٹھاتا ہے کہ ادب کے ذریعے زبان کس حد تک زندہ رہ سکتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ ہم اپنی تہذیب کو کن آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور کن آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ تاریخی نہیں تہذیبی ناول ہے۔ اے. خیام نے اپنے مضمون میں کہا کہ اس ناول کے بہت سے کردار ذہن میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ تاریخی واقعات، گہری تحقیق اور صحت کے ساتھ کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔ ایک خاص عہد کی تہذیبی اور ادبی قدریں سامنے آتی ہیں۔ اردو ادب میں ناول کمیاب ضرور ہیں لیکن چند ناول ایسے بھی ہیں جنھیں ہم بڑے ناول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ ناول ان میں سے ایک ہے۔ سید مظہر جمیل نے صدارتی خطاب میں کہا کہ یہ ناول محض کرداروں کا نہیں، تہذیبی المیے کا ناول ہے اور تہذیب کے مختلف دائرے بناتا ہے۔ اس کا ہیرو کوئی آدمی نہیں، وقت ہے۔ اس میں زوال آمادہ معاشرے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔'' اس ناول کا نام احمد مشتاق کے مندرجۂ ذیل شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

(ڈاک سے)

ترقی پسند خواتین مصنفین کی ادبی خدمات پر دو روزہ کانفرنس

قومی اردو کونسل نے ایک دو روزہ قومی کانفرنس نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی، شیلانگ، میگھالیہ کے اشتراک سے 27 تا28 نومبر2006 کو یونیورسٹی آڈیٹوریم میں منعقد کی جس کا عنوان تھا۔ ''ترقی پسند خواتین مصنفین کی خدمات، ڈاکٹر رشید جہاں کے خصوصی حوالے سے'' افتتاحی اجلاس میں خیر مقدمی کلمات قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر انچارج محترمہ رشمی چودھری نے اور صدارتی خطبہ پروفیسر قمر رئیس نے پیش کیا جب کہ مہمان خصوصی نارتھ اسٹرن ہل یونیورسٹی شیلانگ کے وائس چانسلر پروفیسر پرمود ٹنڈن نے موضوع کی اہمیت سے سامعین کو متعارف کرایا۔

پہلے اجلاس کا موضوع تھا۔ رشید جہاں ''بطور افسانہ نگار اور سماجی کارکن۔'' اس اجلاس میں جن مقالہ نگاروں نے شرکت کی ان میں پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر ریحانہ طارق، جناب محمد قمر الہدیٰ اور ڈاکٹر ابوبکر عباد شامل تھے۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نگینہ جبیں نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کا موضوع ''رشید جہاں کی افسانہ نگاری میں مارکسی فکر کا انعکاس'' تھا۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر نگار عظیم، پروفیسر علی احمد فاطمی اور محترمہ نور ظہیر شامل تھیں صدارت ڈاکٹر علی جاوید نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوبکر عباد نے انجام دیے۔ تیسرے اجلاس کا موضوع تھا۔ ''ترقی پسند افسانے میں نسوانی کرداروں کی تصویر کشی'' اس موضوع پر مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر ثروت خان، محترمہ ٹی. ایم. ایف. زیدی، ڈاکٹر بی. یو. رحیل صدیقی اور ڈاکٹر ارجمند آرا تھے۔ صدارت کی ذمہ داری پروفیسر نقی حسین تقی نے انجام دی۔ چوتھے اور آخری اجلاس میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، بانو قدسیہ کوشلیا اشک اور خالدہ حسین کی ادبی خدمات پر بحث کی گئی۔ اس اجلاس میں محترمہ غزال ضیغم اور ڈاکٹر نگینہ جبیں نے مقالات پڑھے۔ جلسے کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے اور نظامت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔

اس دو روزہ کانفرنس میں قومی اردو کونسل کی نمائندگی ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے کی اور اس کا اختتام قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر انچارج محترمہ رشمی چودھری کے اظہار تشکر پر ہوا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں سیمینار

بنارس، 17 نومبر۔ کو غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اور شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے اشتراک سے ''غالب اور بنارس'' کے عنوان سے ایک دو روزہ سیمینار کا آغاز ہوا۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پنجاب سنگھ نے کہا کہ غالب کی غزلوں میں وہ اثر ہے جو آج بھی لوگوں پر چھایا ہوا ہے اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے غالب اور بنارس کو ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ قرار دیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ غالب کا بنارس سے اتنا والہانہ لگاؤ تھا کہ انھوں نے نہ دہلی کی تعریف کی اور نہ آگرے کی، لیکن بنارس کو مقدس شہر قرار دیا۔ مثنوی ''چراغ دیر'' میں انھوں نے بنارس کی عمارتوں، گنگا کے گھاٹوں، اور وہاں کے پنڈتوں کی خوب تعریف کی ہے۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر سوریہ ناتھ پانڈے نے کہا کہ غالب نہ صرف اردو اور فارسی ادب کے بلکہ ہندوستان کے ہر ادب کے ہر دل عزیز شاعر ہیں۔

18 نومبر کو صبح دس بجے سے شام 7 بجے تک سیمینار کے چار اجلاس ہوئے جن میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر حسن عباس، ڈاکٹر نسیم احمد اور ڈاکٹر یعقوب یاور نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی اور ڈاکٹر سلیم احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اہل اردو کی ذمہ داریاں

نئی دہلی، 9 نومبر۔ غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین، دہلی میں عالمی یوم اردو کے موقعے پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے ''اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اہل اردو کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا جس کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی اور نظامت کے فرائض قاری یٰسین نے انجام دیے۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ شمالی ہند میں اردو کی ابتری کے لیے خود اردو والے ذمہ دار ہیں۔ جب تک اردو والے خود سنجیدگی سے اس زبان کی ترویج و ترقی کی کوشش نہیں کریں گے، اس کا فروغ

نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اردو ہماری تہذیبی میراث ہے اور اس کی حفاظت ہم سب پر فرض ہے۔ ہمارا دینی اثاثہ بھی اردو میں ہے۔ ملک میں اردو کو زندہ رکھنے اور اس کی ترویج و ترقی میں مدارس سب سے اہم اور موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر جمال ہاشمی اور مولانا فرقان احمد قاسمی نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کے آخر میں اردو بطور مضمون پڑھنے کا حق حاصل کرنے والی سرودے کنیا ودیالیہ، سیماپوری کی آٹھ طالبات کو انعامات دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو پر سیمینار

19 نومبر 2006 کو اپنا فاؤنڈیشن پونے نے ایک سیمینار بعنوان ''ہندوستان میں جدید تعلیم کے معمار، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد'' کا انعقاد کیا۔ اپنے پرمغز مقالوں میں ان شخصیات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی جناب عرفان فقیہہ نے دونوں شخصیتوں کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ باوجود کئی متضاد باتوں کے، دونوں میں انسانی رشتوں کی پاسداری، بے پناہ خود اعتمادی، دوقومی نظریے کی نفی اور جذباتی ہم آہنگی جیسی بے مثال خوبیاں مشترک تھیں جن کی وجہ سے انھوں نے ایک انقلاب برپا کیا۔ جناب عرفان فقیہہ نے مولانا اور پنڈت جی کے کئی ان چھوئے گوشوں پر روشنی ڈالی جنھیں سامعین نے بڑے شوق و رغبت سے سنا۔

صدر جلسہ قاضی مشتاق احمد نے کہا کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی مشترکہ کوششوں سے ہندوستان میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج ہوا جس کے فوائد آج نظر آرہے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے خوابوں کی تکمیل ہے۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی کے شکریے کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

(ڈاک سے)

اردو ہفتہ کا انعقاد

مدھیہ پردیش اکادمی کی نئی سکریٹری محترمہ نصرت مہدی کی پہل پر 9 نومبر 2006 سے 14 نومبر 2006 تک اکادمی کے ذریعے پہلی بار ''اردو ہفتہ'' کا انعقاد کیا گیا جس کے تحت صوبے کے اسکولوں میں جلسے منعقد کیے گئے۔ جن میں اسکولوں کے انتظامیہ امور کے عہدیداران اور طلبہ و طالبات اور اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر، سکریٹری محترمہ نصرت مہدی اور جوائنٹ سکریٹری اقبال مسعود نے شرکت کی۔

ان جلسوں میں اسکولوں کے اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات نے حمد پاک، نعت پاک، غزلیں، تقاریر اور موسیقی کے ساتھ ترانے پیش کیے۔ اس کے بعد اسکولوں کے عہدیداران نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ لمحات اسکول کے لیے یادگار لمحات ہیں پہلی بار مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ہمارے اسکولوں میں جلسے منعقد کیے۔

اکادمی کے چیئرمین نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ اچھے کام کی شروعات ہوئی ہے جس سے اردو زبان کا تیزی سے فروغ ہوگا ساتھ ہی انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان اسکولوں میں اردو کی اچھی تعلیم دی جا رہی ہے اس لیے بھی بچوں کا اردو تلفظ اچھا ہے۔

محترمہ نصرت مہدی نے شکریہ کے کلمات ادا کرتے ہوئے یقین دہانی کی کہ آئندہ سال پورے صوبے کے اسکولوں میں شاندار پیمانے پر اردو ہفتہ منایا جائے گا اس سال بھی جن بچوں نے جلسے میں شرکت کر کے حمد، نعت اور غزلیں سنائی ہیں اردو اکادمی کی جانب سے ان سب کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

(ڈاک سے)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ انعامات

غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال معتبر ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کو غالب انعامات دیتا ہے اس سال غالب انسٹی ٹیوٹ سب کمیٹی کی میٹنگ 6 نومبر کو پروفیسر نذیر احمد کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ ممبران نے مندرجہ ذیل دانشوروں کو غالب انعامات برائے سال 2003 منتخب کیا:

1. فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید و تحقیق۔ پروفیسر حامدی کشمیری (سری نگر)۔
2. فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید و تحقیق۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی (علی گڑھ)۔
3. غالب انعام برائے اردو شاعری۔ بلراج کومل (دہلی)۔
4. غالب انعام برائے اردو نثر۔ پروفیسر اسلم پرویز (دہلی)۔
5. ہم سب غالب انعام اردو ڈرامہ۔ شاہد انور (دہلی)۔
6. غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات۔ علیم صبا نویدی (چینئی)۔
7. غالب انعام برائے علمی خدمات (سائنس)۔ اظہار اثر دہلی۔

یہ انعامات مبلغ چالیس ہزار روپے نقد، ایک مجسمہ اور سند پر مشتمل ہیں۔

(''قومی آواز''، دہلی)

کشمیری لال ذاکر کو ''شرومنی ساہتیہ ایوارڈ''

ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر کو ان کی گذشتہ ساٹھ برس کی گرانقدر ادبی خدمات کے مدنظر پنجاب سرکار نے ''شرومنی ساہتیہ ایوارڈ'' برائے سال 2006 سے سرفراز کیا ہے۔ اسی سال 2006 میں حکومت ہند نے بھی ذاکر صاحب پدم شری ایوارڈ سے نوازا ہے۔ قبل ازیں ذاکر صاحب کو کئی نیشنل ایوارڈ مل چکے ہیں جن میں پاکستان کا ''نقوش ایوارڈ'' اور بین الاقوامی پنجابی کانفرنس کا لائف اچیومنٹ ایوارڈ بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں انھیں ''غالب ایوارڈ'' اور ''نہرو لٹریسی ایوارڈ'' سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔

(ڈاک سے)

حبیب ہاشمی کو کیفی اعظمی ایوارڈ

ہوڑہ، 9 نومبر (ایس. این. بی.) ارض بنگالہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ اردو شاعر حبیب ہاشمی کو اہل بنارس نے ایک خصوصی تقریب میں کیفی اعظمی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اطلاع کے مطابق گذشتہ 4 نومبر کو بنارس کے بینیا باغ میں ایک ادبی تنظیم نے انڈو پاک مشاعرہ منعقد کیا اور خصوصی تقریب بھی ہوئی۔ مشاعرے کے کنوینر اشفاق میمن نے حبیب ہاشمی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کیفی اعظمی ایوارڈ انھیں پیش کیا۔ ساتھ ہی معروف شاعر راحت اندوری کو بسم اللہ خاں ایوارڈ اور انور جلال پوری کو نذیر بنارسی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ضمیر یوسف، فیروز اختر، حلیم حاذق، زین الحق خاں آزاد، اکبر حبیبی، محمد علی طارق، فہیم انور، شبیر اصغر، سحر مجیدی، عشرت نبی نگری، جاوید مجیدی، اسلم لکھنوی، شہاب الدین قیس، زاہد رضا، اشرف رضا قادری اور دیگر ادبا و شعرا نے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے اور بعض مبارک باد پیش کی۔

(''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

مختصرات

● نئی دہلی (یو. این. آئی.) اردو تحقیق کی روایت میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام کے بعد کی کوئی بھی فہرست مرحوم نثار احمد فاروقی کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس خیال کا اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے یہاں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام پروفیسر نثار احمد فاروقی کی موت کے دو سال مکمل ہوتے کے موقع پر ایک نشست میں کیا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ مجھے خطوط غالب پر کام کرنے کی تحریک ان سے ملی۔ اس موقع پر شریف حسین قاسمی نے ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت علم کا خزانہ تھی۔ وہ پڑھاتے عربی تھے اور دوستی فارسی والوں سے رکھتے تھے۔ فارسی کے نامور پروفیسر قاسمی نے مرحوم سے وابستہ کئی دلچسپ باتیں بتائیں۔ صدیق الرحمن قدوائی نے ان سے اپنی قلبی وابستگی کا اعتراف یوں کیا کہ مجھے ہر پل یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ ہیں۔

ابن کنول نے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی خاکساری اور انکساری بیان کی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے بتایا کہ انھیں انشاء پر تحقیق کے لیے انھوں نے ہی آمادہ کیا تھا۔ اور میر کے سینکڑوں اشعار انھیں سے سن کر مجھے یاد ہوئے تھے۔

گلزار دہلوی نے کہا کہ وہ چلتی پھرتی لائبریری تھے اور پورے برصغیر میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ آخر میں صدر جلسہ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تصوف میں بھی ان کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا کیونکہ ان کا شجرہ بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر عبدالودود اظہر، مجتبیٰ حسین، متین امروہوی اور مرحوم کے فرزند ارجمند نجم الہادی بھی موجود تھے۔

(''قومی آواز''، دہلی)

● اجین، اردو کے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین پاکستان سے یہاں جشن کالی داس میں سنسکرت ڈرامے دیکھنے کے لیے تشریف لائے اس موقع پر اردو ہندی کے تخلیق کاروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

بزم فنکار کے زیر اہتمام منعقدہ اعزازی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمود زکی نے فرمائی۔ انھوں نے مہمان خصوصی کا گلپوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ ڈاکٹر اردن ورما نے بھی گلپوشی فرمائی اور کہا کہ انتظار حسین کی کہانیاں برسوں سے پڑھی جا رہی ہیں۔ میں نے ان کا افسانہ ''کشتی'' پڑھ کر ان کی تحریروں سے آشنائی حاصل کی تھی۔ ان کی تخلیقات اردو کے ساتھ ہندی میں بھی بے حد مقبول ہوئی ہیں۔

صدر جلسہ ڈاکٹر محمود زکی نے انتظار حسین صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اجین شہر علم و ادب کا قدیم ترین مرکز رہا ہے۔ کالی داس بھرتری ہری، بھاس اور اردو کے مفتی خیر اللہ صدیقی کی ادبی اہمیت اور تاریخی حیثیت کو ہمیشہ سراہا جاتا ہے۔ صدیوں سے یہاں کی داستانوں کی گونج فضاؤں میں نور برساتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین نے کہا کہ اس موقع پر انتظار حسین صاحب کو اپنے درمیان پا کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا ہے۔ نئی نسل آج بھی ان کے فن سے مستفیض ہو رہی ہے اور آج اپنے درمیان انھیں پا کر فخر کے جذبات سے ہمکنار ہے۔

مہمان خصوصی انتظار حسین نے جوابی تقریر میں اجین کی قدامت یہاں کی روایتی، کلاسکی کہانیوں سنگھاسن بتیسی، پریم پچیسی اور کالیداس کی ڈرامائی تخلیقات شکنتلا، وکرم اروسی، مالویکا اگنی متر کے حوالے سے کہا کہ ان کہانیوں کو ہم نے اپنے بچپن میں سنا اور پڑھا تھا تب سے اس شہر کی عظمت میرے دل میں موجزن تھی۔ میرے کرم فرما اشوک واجپئی نے اس جشن میں سنسکرت ڈراموں کو دیکھنے کی تحریک فرمائی اور میں یہاں حاضر ہو گیا مجھے بہت اچھا لگا۔

جلسے کی نظامت ڈاکٹر ظفر محمود نے فرمائی اور شکریے کے کلمات روبینہ عرشی نے ادا کیے۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی، 29 نومبر۔ افسانہ نہ صرف ہمارے سماج کا عکاس ہوتا ہے بلکہ وہ ہمیں اور ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑتا بھی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ''محفل افسانہ'' میں کیا۔ بزم ادب شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے آج کے مشہور و معروف ناول و افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ اس موقع پر شعبہ کے دیگر طلبہ نے بھی اپنے افسانے پیش کیے، جس میں علی احمد ادریسی، نور عالم، عالیہ اور محمد ارشد شامل تھے۔ بعد ازاں بزم کے مہمان خصوصی مشرف عالم ذوقی نے اپنا افسانہ ''دادا اور پوتا'' پڑھا۔ بزم کی صدارت پروفیسر صادق نے کی۔ انھوں نے علامتی افسانے کی تردید کرتے ہوئے حقائق پر مبنی افسانوں پر زور دیا۔ پروفیسر ابن کنول نے اردو افسانے کے حوالے سے اس کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے طلبہ کو حالات کے موافق افسانہ نگاری کا مشورہ دیا۔ اس میں اہم شرکا ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر رضوان الحق، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر ابو شہیم خاں، ڈاکٹر زاہد الحق، ڈاکٹر تنویر حسین، ڈاکٹر مجیب احمد خاں اور ڈاکٹر اکمل شاداب موجود تھے۔ آخر میں محمد کاظم نے تمام اساتذہ و مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

● گلبرگہ۔ حلیمہ ادبی و ثقافتی مرکز کا ماہانہ اجلاس حلیمہ کمپیوٹر سینٹر کے ہال میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر عبدالعزیز نے بہ عنوان مستقبل کے تقاضے ایک بہت ہی معلوماتی اور جامع لکچر دیا۔ انھوں نے اپنے لکچر میں کہا کہ ہمیں اپنا تشخص اگر برقرار رکھنا ہے تو اپنے پرکھوں کے کارناموں اور ان کے انداز و فکر کا بہ خوبی اندازہ لگانا ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے نوجوان طلبہ و طالبات کو مشورہ دیا کہ وہ کس طرح خود کو مستقبل کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ پورا عالم سکڑ کر ایک عالمی دیہات میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مسابقت عہد حاضر اور مستقبل کی شرط اول کی حیثیت حاصل کر گئی ہے۔ کمپیوٹر کی تعلیم آج ہماری زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ آج یہ بہت ضروری ہے کہ ہم وقت کا بہتر استعمال کرنا سیکھیں۔

امجد جاوید نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ آج کے نوجوانوں میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں معاشرے کے ذمہ داروں کا یہ فرض ہے کہ اُن کی بھرپور تربیت کے جتن بھی کریں۔ جلسے کا اختتام اسد جاوید کے شکریے کے ساتھ ہوا۔

(ڈاک سے)

● اعظم کیمپس، پونے کے زیر اہتمام 25 نومبر 2006 کو ایک پروگرام بعنوان ''میراث'' کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ امتیاز خلیل کا پیش کردہ ایک تصویری، تحریری اور شعری خاکہ ہے جو موسیقی کی آمیزش کے ساتھ مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کی حیات و خدمات کو اجاگر کرتا ہے۔ شمیم طارق، معتبر پیر بھائی، ممتاز پیر بھائی اور خود امتیاز خلیل نے ان تینوں شخصیات کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ سامعین کی نظروں میں ان شخصیات کی یاد تازہ ہو گئی۔

اپنی نوعیت کے اس انوکھے اور مختصر پروگرام میں ان تینوں ہستیوں کو بڑے مؤثر انداز میں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ سیما اثر سہگل، خلیل احمد، مختار احمد اور آصف اقبال کی غزل سرائی نے اس پروگرام کو مزید دلچسپ بنا دیا۔

(ڈاک سے)

● راوڑکیلا۔ سحر انگیز اردو شاعری کل کی طرح آج بھی اپنی تہذیبی سرحدوں کی پابند نہیں جس کی مثال مشرقی ہند کی ریاست اڑیسہ میں ''یوم اردو'' کے موقع پر سامنے آئی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر یہاں شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں محبان اردو نے شرکت کی۔ مشاعرے کا اہتمام اڑیسہ فروغ اردو کونسل نے کیا تھا۔

مشاعرے کا آغاز قومی ترانے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' سے ہوا اور مشاعرے کے مہمان خصوصی پولیس سپرنٹنڈنٹ دھیریندر ایس کٹے نے شعرائے کرام اور سامعین سے کہا کہ اردو بہت ہی پرکشش زبان ہے جس کا ہندوستانی فلموں میں بھی بول بالا ہے۔ مشاعرے میں خصوصی مدعو شاعر گوتم مترا اور پیاشا ندرت کے علاوہ جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ کے شعرا کے علاوہ مقامی شاعروں نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت گھائل فریدی نے کی۔ نظامت کے فرائض انجم اظہر نے انجام دیے۔

(''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

● راور کیلا (اڑیسہ) مقامی آنند بھون لین واقع نواب گیرج میں آل اڑیسہ فروغ اردو کاؤنسل راور کیلا کی جانب سے 9 نومبر کو یوم اردو منایا گیا اس موقع پر شام سات بجے سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ جس میں کثیر تعداد میں محبان اردو موجود تھے۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس راور کیلا جناب دھیریندرا ایس کھنگے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

شعرا میں خصوصی طور پر مدعو کیے گئے مہمان شاعر جناب گوتم مترا گوتم اور شاعرہ بپاشا قدرت کے علاوہ جھارکھنڈ سے جناب الیاس آور چکر دھر پوری، جناب عبدالمجید طالب چکر دھر پوری، شاعر و نقیب جاس پور (چھتیس گڑھ) جناب انجم اظہر صاحب، راجگانگپور سے استاد شاعر جناب گھائل فریدی، مقامی نسرین نکہت، مخجر غازی پوری، جناب داس دیوچن، معین رونق، قیصر چاند، وغیرہ شریک ہوئے مشاعرہ کا آغاز طالبہ تمنا پروین کی مترنم آواز میں قومی ترانہ" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے ہوا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض جناب انجم اظہر نے انجام دیے اور صدارت جناب گھائل فریدی نے کی۔

(ڈاک سے)

● رانچی، 16 نومبر۔ جھارکھنڈ کے چھٹے یوم تاسیس کے موقع پر ریاست کے مختلف علاقوں میں خوشیاں منائی گئیں۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ مدھوکوڑا نے اردو، بنگالہ اور سنتھالی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا۔ دیر رات تک ثقافتی پروگرام جاری رہا۔ اس پروگرام میں تحریری اور تقریری مقابلے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

● نئی دہلی، 25 نومبر۔ الحاج شیخ محمد ابراہیم (جاپان والے) میموریل انگ ٹرانی کے لیے "میڈیا ہمارے سماج میں انتشار پیدا کر رہا ہے" کے عنوان پر دہلی کے 16 اسکولوں کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ابن کنول کی صدارت میں ہونے والے اس مقابلے میں شیخ محمد ہارون (جاپان والے) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مقابلے میں اینگلو عربک اسکول کی ٹیم کو مجموعی طور پر بہتر کارکردگی کے لیے شیخ ابراہیم ٹرانی سے نوازا گیا جب کہ انفرادی انعامات میں اینگلو عربک اسکول کے بدر ارشاد اور شفیق میموریل اسکول کے محمد محمود دوم اور اینگلو عربک اسکول کے محمد آصف علی سوم قرار دیے گئے۔

کریسنٹ اسکول کی وجیہ نواب اور زینت محل سرودو یہ کنیا ودیالیہ جعفر آباد کی طالبہ شاہین کو ان کی عمدہ تقاریر کے لیے خصوصی حوصلہ افزائی کے انعامات سے نوازا گیا۔ پروگرام کے انعقاد میں فتح پوری اسکول کی منتظمہ کمیٹی کے چیئرمین شیخ ریاض عمر، منیجر ایس ایم شکیل، پرنسپل خالد نذیر، وائس پرنسپل، فرحت عزیز اور پی ٹی اے کے سکریٹری مصلح الدین نے اہم کردار ادا کیا۔ نظامت کے فرائض پروگرام کے کنوینر محمد اجمل خاں نے انجام دیے جب کہ ذاکر حسین کالج میں اردو کے استاد ڈاکٹر مظہر احمد اور ماتا سندری کالج کی ڈاکٹر عفت زریں نے ججوں کے فرائض انجام دیے۔ ("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

● کولکاتا، 16 ستمبر۔ معروف ادیب شبیر احمد، بیلگھریائی کی رہائش گاہ پر سہ ماہی "ترکش" کولکاتا کی طرف سے معروف شاعر کمال جعفری کو اعزازیہ دیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر احمد رئیس نے کی اور نظامت کے فرائض شبیر احمد نے انجام دیے۔ سید حسن نے صاحب اعزاز کا خاکہ پیش کیا جس میں موصوف کی شخصیت وفن پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کے بعد شعری دور کا آغاز ہوا جس میں شعرائے کرام نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

ابوذر ہاشمی، فراغ روہوی، شبیر احمد، احمد کمال، نسیم عزیزی، اسلم لکھنوی، اسلم اقبال، عرفان ظہیر، ارم انصاری اور طالب صدیقی کے نام شامل ہیں۔ صاحب اعزاز نے مدیر "ترکش" فراغ روہوی کا شکریہ ادا کیا اور کولکاتا سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کی موجود ادبی فضا کے تئیں خوشی کا اظہار کیا۔ صدارتی تقریر میں احمد رئیس نے صاحب اعزاز کے فن وفکر پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اخیر میں مدیر "ترکش" نے جملہ شرکائے کرام اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● نینی تال، 26 نومبر۔ نینی تال مہااتسو کمیٹی کے زیر اہتمام مہااتسو کے موقع پر رنک ہال اسٹیڈیم مال روڈ میں آل انڈیا انٹی لکچول پیس اکیڈمی کے تعاون سے کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اترانچل سرکار کے اقلیتی بہبود و وقف کے چیئرمین رئیس احمد نے صدارت اور نظامت اعجاز انصاری نے کی۔ افتتاح نگر پالیکا پریشد کی چیئرمین سریتا آریہ نے کیا۔ پیس اکیڈمی کے فاؤنڈر چیئرمین ڈاکٹر آصف بریلوی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی ان میں مونس بریلوی، ساحل سحری، سید آباد جعفری، شہباز ندیم ضیائی، اعجاز انصاری، قاصر سہسوانی، شبنم سلطانہ، شرف نانپاروی، گلزار سہسوانی اور فلک نازنینی تالوی کے علاوہ قمر انقلابی، رعنا ضیا اور رئیس ناز بجنوری بھی قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

کلیاتِ حسن نعیم

● جے.این. یو لینگویج بلاک کے کمیٹی ہال میں ''کلیات حسن نعیم'' (ترتیب و تدوین: احمد کفیل) کی رسم اجرا فیکلٹی کے ڈین پروفیسر وریام سنگھ، وزیٹنگ پروفیسر عبدالحق اور ہندوستانی زبانوں کا مرکز کے چیئرمین پروفیسر محمد شاہد حسین کے ہاتھوں ادا کی گئی یہ کتاب قومی اردو کونسل نے شائع کی ہے۔ پروفیسر وریام سنگھ نے احمد کفیل کی اس کاوش پر انھیں مبارک باد دی۔ چیئر پرسن پروفیسر محمد شاہد حسین نے کہا کہ رسم اجرا کا پروگرام ان معنوں میں اہم ہوتا ہے کہ ہم کسی کے کام کا تجزیہ ایمانداری سے کریں۔ شعبے کے ریسرچ اسکالرز میں عبدالواسع، عبدالرب اور جاوید رحمانی نے احمد کفیل کی ترتیب و تدوین اور حسن نعیم کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔ جناب مخمور سعیدی نے حسن نعیم کی شاعری کا لسانیاتی و فکری تجزیہ کرتے ہوئے انھیں نئی غزل کا منفرد اور نمائندہ شاعر اور کلیات حسن نعیم کی تدوین کو ایک تاریخی کام قرار دیا۔ شعبے کے وزیٹنگ پروفیسر عبدالحق نے حسن نعیم کو شہید زمانہ قرار دیتے ہوئے ان کی فارن سروس، ایوان غالب کی ڈائرکٹرشپ اور احباب سے ان کے مراسم کے واقعات سنائے اور کہا کہ حسن نعیم نے اس آشوب سے گزر کر بھی قلم کے تقدس کو برقرار رکھا یہ ایک نادر مثال ہے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر مظہر مہدی، ڈاکٹر گوبند پرساد اور دیگر اساتذہ کے علاوہ کثیر تعداد میں ریسرچ اسکالر موجود تھے۔ نظامت کے فرائض شعبے کے اسکالر جناب جمشید احمد نے ادا کیے اور آخر میں ظفر اللہ انصاری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مرزا یاس یگانہ چنگیزی ـــــ حیات اور شاعری

● آرہ، 29 نومبر۔ یاس یگانہ چنگیزی اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ لیکن ان کی شاعرانہ شخصیت کی تفہیم کے لیے انھیں ان کی اپنی تخلیقی زمین پر تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں غالب کو بھولنا ہوگا اور علاقائیت کو فراموش کرنا ہوگا۔ مذکورہ باتیں وسانتا کالج بنارس کے اردو ادب کے استاد ڈاکٹر یعقوب یاور نے کہی۔ وہ آج یگانہ چنگیزی پر تمثیل احمد کی کتاب ''مرزا یاس یگانہ چنگیزی ـــــ حیات اور شاعری'' کی رسم اجرا کے موقع پر ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے اردو وفارسی شعبہ میں منعقدہ پروگرام میں خطاب کر رہے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر یعقوب نے یگانہ کی شخصیت، ان کی شاعری اور غالب سے ان کے اختلافات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ناز قادری نے یگانہ کے سلسلے میں اہل بہار کی ناقدری پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہار والوں نے جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی جیسی شخصیتوں پر بھی اتنا کام نہیں کیا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو و فارسی ڈاکٹر حسین احمد نے اپنی افتتاحی گفتگو میں یگانہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ یگانہ کے زرخیز و خلاق ذہن نے ہر قسم کی تقلید سے انحراف کیا۔ جلسہ کی صدارت مشترکہ طور پر اردو، ہندی اور انگریزی شعبوں کے صدور نے کی۔ اس موقع پر صدر شعبہ انگریزی ڈاکٹر ڈی کے سنہا، ڈاکٹر رویندر رائے، پروفیسر صلاح الدین حیدر اور عبدالرشید شامل تھے۔ شعبہ اردو و فارسی ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ کے طلبہ و طالبات نے رسم اجرا کی اس محفل میں کثیر تعداد میں شرکت کی۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

بہت دور تک رات ہوگی

● نئی دہلی، 17 نومبر۔ جامعہ کلچرل کمیٹی اور مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کے زیر اہتمام آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے پروفیسر زاہدہ زیدی کی نئی کتاب ''بہت دور تک رات ہوگی'' (ڈراما) کا اجرا کیا۔ پروگرام میں ادب اور فن سے وابستہ لوگوں اور دانشوروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت شاہد مہدی نے اور نظامت ہمایوں ظفر زیدی نے کی۔ شاہد مہدی نے کہا کہ اگر آج کے دور میں یہ ڈراما کھیلا جائے تو بہت بہتر ہے۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ گجرات پر لکھنے سے قبل زاہدہ زیدی نے خلیجی جنگ پر بھی ''صحرائے اعظم'' کے نام سے ایک کامیاب ڈراما لکھا تھا۔ پروفیسر تقی حسین جعفری نے کہا کہ بارہ مناظر والے اس ڈرامے میں گجرات میں منظم طور پر کی گئی مسلمانوں کی نسل کشی اور قتل و غارتگری کی داستان ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ کا سارا بیان اشارہ و کنایہ، علامتوں اور استعاروں کی زبان میں ہے۔ پروگرام کے آغاز میں ہمایوں ظفر زیدی نے مصنفہ کی ادبی و شعری خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس پروگرام میں جامعہ ملیہ کے پروفیسر فیضان احمد، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر خالد جاوید، پروفیسر ساجدہ زیدی اور ڈاکٹر رضوان احمد کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

جدو جہد اور تعمیر نو

● نئی دہلی، 11 نومبر۔ مزدور لیڈر شہید شنکر گوہانیوگی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ڈاکٹر انل سد گوپال کی ہندی کتاب کے اردو ایڈیشن "جدو جہد اور تعمیر نو" کا آج پریس کلب میں اجرا کیا گیا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ پاکستان کے ٹریڈ یونین لیڈر رفعت حسین نے کیا ہے اور دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب کو "پلر" (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ) کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے مترجم رفعت حسین ویزانہ ملنے کے سبب اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکے۔ تقریب کی نظامت کرتے ہوئے کراچی سے آئے ہوئے "پلر" کے عہدیدار کرامت علی نے کہا کہ اس کتاب میں شہید شنکر گوہانیوگی کی اپنی تحریریں بھی شامل ہیں اور مزدوروں کی زندگی کے ساتھ سیاسی اور معاشرتی ایشوز پر ان کے خیالات ونظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شنکر گوہانیوگی کی مزدوروں کے لیے خدمات اور مزدور تحریک کے لیے ان کی قربانیوں کا ہر ایک نے اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب کی اشاعت سے دونوں ملکوں کے مزدور طبقے کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس خطے میں امن، انصاف اور عام لوگوں کے مفادات کے لیے کام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس موقع پر کتاب کے اصل مصنف ڈاکٹر انل سد گوپال، چھتیس گڑھ مکتی مورچہ کے لیڈر جنک لعل ٹھاکر اور دہلی یونیورسٹی میں اردو کے استاد ڈاکٹر علی جاوید نے بھی اظہار خیال کیا اور رفعت حسین کے اس قدم کی ستائش کی۔ (ڈاک سے)

اردو مثنوی کے ارتقا میں بہار کا حصہ

● بہار شریف، 23 نومبر۔ علامہ اقبال کالج بہار شریف کے استاد ڈاکٹر شرف حیات کی کتاب "اردو مثنوی کے ارتقا میں بہار کا حصہ" کی رسم اجرا بہار شریف میں منعقد عالمی مشاعرے میں انجام پائی۔ سامعین کی کثیر تعداد اور شعرائے کرام کی موجودگی میں پاکستان سے تشریف لائے مہمان شاعر اعجاز رحمانی اور ہندوستان کے نمائندہ شاعر گلزار دہلوی نے کتاب کی رونمائی کی اور جناب شرف حیات خان کو مبارکباد دی۔ اس موقع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی کے پروگرام اکزیکیوٹیو کمال جعفری نے شرف حیات اور کتاب کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر شرف حیات نے اس موقع پر سید شاہ جاویدی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس بڑے فنکشن میں اس کتاب کے اجرا کی اجازت دی اس موقع پر پروفیسر حنیف کیفی، ڈاکٹر توقیر احمد خان، رفعت سروش، فراغ روہوی اور احمد رئیس، ڈاکٹر آفاق، ذکیہ غزل، ڈاکٹر نزہت انجم، اعجاز رحمانی اور دیگر ادبا وشعرا موجود تھے۔ ("فاروقی تنظیم"، پٹنہ)

تعارف اور تجزیہ

● کولکاتا، 19 نومبر۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری سب کمیٹی کے زیر اہتمام 19 نومبر کو "تعارف اور تجزیہ" کی رسم اجرا کی تقریب میں مشہور صحافی و افسانہ نگار رئیس احمد جعفری نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں کہا کہ ابوالکلام رحمانی نے اپنی علمی صلاحیت کا استعمال لگن اور سنجیدگی کے ساتھ کیا ہے اور جب کوئی اس راہ پر گامزن رہتا ہے تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ پروفیسر سلیمان خورشید نے کتاب کے اقتباسات پیش کیے اور کہا کہ رحمانی صاحب نے صرف توصیفی انداز نہیں اپنایا ہے بلکہ تنقید وتبصرہ سے بھی کام لیا ہے۔ قاصر مکرم پوری نے ابوالکلام رحمانی کے ادبی کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے مرتب سعید احمد کے ادبی لگاؤ کا بھی اظہار کیا اور مبارکباد دی۔ نظام شمیم نے کتاب میں جن اہل قلم پر مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کے تعلق سے اپنے تاثرات بیان کیے اور کتاب کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا۔ قیصر شمیم نے کتاب میں شامل مضامین کے حوالے سے زبان و بیان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کتاب کی اشاعت کے لیے رحمانی وسعید احمد کو مبارکباد دی۔

کتاب کے مرتب سعید احمد نے بھی اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کیا۔ صدر محفل حضرت علقمہ شبلی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ابوالکلام رحمانی کی ادبی کاوشوں سے میں آشنا رہا ہوں۔ خاموش طبع رحمانی صاحب اپنے کام سے پہچانے جائیں گے۔ تذکرۂ مشاہیر ادب کے بعد "تعارف و تجزیہ" دونوں ہی پذیرائی کی مستحق ہیں۔ ("آبشار"، کولکاتا)

ترویج ــــ ظفر ہاشمی نمبر

● کٹک، 9 نومبر کو شتابدی بھون میں "یوم اردو" کے سلسلے میں ایک تقریب، انجمن ترقی اردو ہند (اڑیسہ) اڑیسہ اردو اکادمی اور فیضان ادب کے اشتراک سے منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر سلسلہ وار ادبی رسالہ "ترویج" کے "ظفر ہاشمی نمبر" کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ مذکورہ تقریب میں پروفیسر

کرامت علی کرامت، پروفیسر قمر الدین خان، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، پروفیسر منظور احمد قاسمی، سید مستفیض احمد، ڈاکٹر لیاقت علی، سعید رحمانی، داؤد الرحمٰن، خاور نقیب (ایڈیٹر، ترویج) ڈاکٹر نسیمہ بیگم، ڈاکٹر اختر حسین شافی ڈاکٹر سید مشتاق علی (کنوینر) سید نور الٰہی ناطق (سکریٹری، فیضانِ ادب) کشور جہاں اور برکت علی تنویر وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ (ڈاک سے)

سفرِ سفرِ خواب

● علی گڑھ، 9 نومبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سرسید ہال (نارتھ) کی میگزین ''سفر سفرِ خواب'' کا اجرا وائس چانسلر نسیم احمد نے ہال کے کلچرل روم میں کیا۔ اپنے خطاب میں وائس چانسلر نے کہا کہ ہال میگزین سرسید کے زمانے سے ہی شائع ہو رہی ہے۔ انھوں نے سرسید کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو نہ صرف سرسید کی حیات بلکہ ان کی تحریروں سے بھی سبق لینا چاہیے اور تحریری عمل میں مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہال میگزین طلبہ کے لیے لکھنے کا ایک مضبوط وسیلہ ہے اور طلبہ کو اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ جناب نسیم احمد نے کہا کہ آج کے مسابقتی دور میں وہی شخص اپنا مقام محفوظ کر پائے گا جو گزرے لوگوں سے بہتر کام کرے گا۔ وائس چانسلر نے کہا کہ آج کے دور میں قلم کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے اور یہی طاقت انسان کو مضبوط بناتی ہے۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

جانے والوں کی یاد

رفیق الزماں

● نئی دہلی، 28 نومبر۔ اردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کے رکن اور ''صبح فردا'' کے مدیر رفیق الزماں کا آج دوپہر اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ اردو اکادمی کے دفتر میں جاری اسکولی طلبہ کے مقابلوں میں شرکت کر رہے تھے۔ اکادمی کے پروگرام انچارج محمد راغب کی اطلاع کے مطابق اردو اکادمی کے کشمیری گیٹ واقع دفتر میں ان دنوں اسکولی طلبہ کے تعلیمی و ثقافتی مقابلے چل رہے ہیں۔ رفیق الزماں اسی پروگرام میں آبزرور کے طور پر شرکت کے لیے آئے تھے۔ پروگرام کے دوران انھوں نے طلبہ سے مختصر خطاب کیا اور انھیں مبارکباد دینے کے بعد اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ مشکل سے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گئے۔ جب ان پر اکادمی کے عملہ کی نظر پڑی تو انھیں فوراً نزدیک ہی واقع سنت پرمانند اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔ وہ 50 برس کے تھے اور ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ اور ایک بیٹا ہے۔

رفیق الزماں معروف صحافی شمس الزماں کے چھوٹے بھائی اور بھاگلپور بہار کے رہنے والے تھے۔ یہاں وہ کافی عرصے سے اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہتے تھے اور ادبی حلقوں میں ان کی کافی پذیرائی کی جاتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور دہلی دوردرشن سے بھی ان کے پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

واجد سحری

● نئی دہلی، ۱۱ دسمبر۔ مشہور شاعر اور بزم ساز و ادب کے جنرل سکریٹری سید واجد حسین واجد سحری کا انتقال ہو گیا۔ اطلاع کے مطابق مرحوم آج سہ پہر ایک ادبی جلسے میں شرکت کی غرض سے گھر سے نکلے اور گھر کے قریب ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جوراً ہی اسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے برین ہیمرج بتایا اس کے کچھ ہی دیر بعد ان کا انتقال ہو گیا مرحوم کی عمر تقریباً 66 سال تھی، کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آج ہی ان کے ایک شعری مجموعے ''آواز کا درپن'' کا اجرا غالب اکیڈمی میں ہونا تھا۔ مرحوم غیر شادی شدہ تھے اور اپنے بڑے بھائی کے بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ مرحوم کا تعلق رام پور سے تھا۔ (''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

تبصرہ و تعارف

شیر شاہ اور اس کا عہد
مصنف: کالکارنجن قانون گو
مترجم: رام آشرے شرما
صفحات: 704، قیمت: -/135 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: محمد عمر رضا، ای۔ 224، مہاندی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔ 67

کالکا رنجن قانون گو نے 1931 میں شیر شاہ سوری کی سوانح حیات کو اپنی اہم کتاب ''شیر شاہ'' میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعد میں انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ابھی اس موضوع سے انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے شیر شاہ پر مزید تحقیق شروع کی اور تقریباً 19 سال اس کی تیاری میں مصروف رہنے کے بعد مزید دس سال کی محنت و جانفشانی سے انگریزی میں اپنی شاہ کار کتاب ''شیر شاہ اینڈ ہز ٹائمس'' مکمل کی جو اکتوبر 1964 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے انگریزی ترجموں کی بجائے اصل فارسی نسخوں کے مطالعے کو ترجیح دی ہے بعد ازاں نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے پہلی بار اس کا اردو میں ترجمہ کروا کے ''شیر شاہ اور اس کا عہد'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

کالکا رنجن نے اپنی اس کتاب میں بڑی چھان پھٹک کی ہے اور بنیادی ماخذ کے ذریعے شیر شاہ اور اس کے عہد کو قارئین کے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا ہے جس سے قارئین شیر شاہ اور اس کے عہد سے پوری طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ '' شیر شاہ نے محض 5 سال حکومت کی لیکن اتنے سے ہی قلیل عرصے میں اس نے اپنے لیے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ بلا شبہ اکبر اعظم کے بعد اگر کسی کو قابل حکمراں تسلیم کیا جا سکتا ہے تو وہ شیر شاہ ہی ہے۔'' (ص۔680)

اٹھارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں یکے بعد دیگرے فرید عرف شیر شاہ کے مورث اعلیٰ اور اس کے بچپن، تعلیم، آوارگی، شادی کے واقعات اس کی مصالحت، فرید کی ابتدائی زندگی سے متعلق ابوالفضل کی رائے، والد کی جاگیر کا انتظام، اس کا نظام حکومت اور مالی اصلاحات، جنگی مہمات اور تعزیری مہم، دربار میں قسمت آزمائی اور سہسرام کو واپسی، فرید کو شیر خاں کا خطاب ملنا، نائب گورنر بہار کے عہدے پر فائز ہونا، چنار کے قلعے پر قبضہ، مخدوم عالم سے مصالحت اور اس کا انجام، بنگال کی حملہ آور فوج کو شکست دینا، سورج گڑھ کی لڑائی اور اس میں فتح یابی نیز لوہانیوں کا فرار ہونا، تاج کی تلاش، ہمایوں کی بہادر شاہ سے لڑائی اور شیر شاہ کا بچ کے نکل جانا، محمود کی شیر شاہ کے خلاف پرتگالیوں سے امداد کی درخواست، شیر شاہ کا گوڑ پر پہلا حملہ، بنگال کے لیے ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ، شیر شاہ کے اطاعت کیش رویے سے ہمایوں کا فریب میں آ جانا، شیر شاہ کا بنگال پر دوسرا حملہ، ہمایوں کی بنگال مہم، شیر شاہ کی تاجپوشی کی پہلی تاریخ، مغلوں کے خلاف شیر شاہ کی جارحانہ کارروائی، ہمایوں کی دگرگوں حالت اور چوسہ میں صلح کی گفت وشنید، چوسا کی لڑائی، بنگال کی دوبارہ فتح اور دوسری رسم تاج پوشی، چوسہ کی لڑائی کے بعد مغلوں کی صورت حال، جنگ بلگرام عرف جنگ گنگا، سلطنتِ ہند کی از سر نو تعمیر، ہندوستان سے مغلوں کی ہجرت، شیر شاہ کا لاہور اور خوشاب کے لیے سفر، شیر شاہ کے مسائل اور پنجاب کی سرحدی پالیسی، سرحد کشمیر پر شیر شاہ کی کارروائی، ملتان میں شیر شاہ کی پالیسی کا آغاز، پنجاب کے گورنر ہیبت خاں کا ملتان اور شمالی سندھ کو فتح کرنا بنگال اور مالوہ کی فتح اور شیر شاہ کی سلطنت میں ملایا جانا، مارواڑ پر حملہ اور اخیر میں شیر شاہ کی آخری مہم اور اس کے انتقال کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے تنقیدی نقطۂ نظر کو ہر جگہ مقدم رکھا ہے اور تمام حقائق کو بڑے منطقی اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر باب کے اخیر میں ضمیمہ کے تحت معروضی بحث کی ہے اور مختلف مصنفین کی آرا سے اپنی آرا کا موازنہ کر کے ایک منصفانہ اور غیر جانبدارانہ نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی دستاویزی حیثیت مسلّم ہے۔

تاریخ جہانگیر / ڈاکٹر بینی پرساد
مترجم: رحم علی الہاشمی
صفحات: 365، قیمت -/90 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو. نئی دہلی۔ 67

عہد وسطیٰ کے مورخین میں بینی پرساد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے وہ شعبۂ سیاسیات الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ ''تاریخ جہانگیر'' ان کی مشہور تصنیف ہے جس کا ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے۔ اس کے مترجم رحم علی الہاشمی ہیں۔

مغلوں کی تاریخیں جو عام طور پر دستیاب ہیں وہ تاریخ نگاری کے جدید طرز پر بہت کم مبنی ہیں اور ان میں افسانہ و افسوں کی آمیزش بہت زیادہ رہی ہے جس کی ذمہ داری کچھ تو ہندوستانی طرز فکر پر عائد ہوتی ہے اور کچھ ہمارے بعض انگریز مورخین کی نوازشوں پر جنھوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کم وبیش یہی رویہ جہانگیر کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔ ان کے تعلق سے کئی قصے مشہور ہیں جن میں مرکزی حیثیت شیر افگن کے قتل کے قصے کو حاصل ہے کہ شیر افگن کی بیوی نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے جہانگیر نے کئی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد شیر افگن کا قتل کرایا اور پھر نور جہاں نے پہلے تو جہانگیر کے پیغام کو ٹھکرایا لیکن تین چار سال کے بعد قبول کرلیا اور ملکۂ ہندوستان کی حیثیت حاصل کرلی۔

بنی پرساد نے اپنی کتاب ''تاریخ جہانگیر'' میں جہانگیر کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب جہانگیر کے بچپن سے آخری ایام تک کے واقعات پیش کرتی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے عہد جہانگیر کے طرز معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بنی پرساد لکھتے ہیں ''ہندوستان کی تاریخ میں کوئی چیز اتنی جاذب نظر نہیں ہے جتنی ہند اسلامی تہذیب، طور طریقہ اور رسم ورواج جسے ہم اب تک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی مسلمان تارکان وطن ٹھیک طور سے آباد ہو گئے انھوں نے اپنے ہمسایوں پر اثر ڈالنا شروع کردیا اور خود اپنے ہندوستانی ہمسایوں سے اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ متاثر ہوئے۔'' یہ اقتباس بنی پرساد کی وسیع المشربی کو ظاہر کرتا ہے جو ایک مورخ کے لیے ضروری ہے۔ نور جہاں کے تعلق سے بھی بنی پرساد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''ہندوستان کی قرون وسطی کی تاریخ میں کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ اتنا رومان وابستہ ہو جتنا نور جہاں کا نام آتے ہی ذہن میں آجاتا ہے۔''

بنی پرساد نے نور جہاں اور جہانگیر کے تعلق سے تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ ''مارچ 1611 میں جہانگیر نے اتفاقاً اسے موسم بہار کے فینسی بازار میں دیکھا اور اس پر عاشق ہوگیا اور مئی کے آخر میں اس سے شادی کرلی'' جب کہ شیر افگن کا قتل 30 مارچ 1607 کو ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کی موت کے تقریباً چار سال بعد نور جہاں کو دیکھا لہٰذا نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا صریحاً غلط ہے۔

یہ کتاب اس عہد کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے حد اہم ہے اور اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے مصنف نے خلاصۂ کلام اور تین ضمیمے بھی شامل کر دیے ہیں جو کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ترجمہ سادہ اور سلیس ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس کی اشاعت کے لیے مبارک باد کی مستحق ہے۔

مشک چور شکاری/ سمرن کور

مترجم: سید پرویز

صفحات: 80، قیمت: -/19 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آر کے. پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: مخمور صدری، 307 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 110067

اردو کے اکثر ادبا، شعرا اور ناقدین نے ''ادب اطفال'' سے بے اعتنائی برتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں بچوں کا ادبی سرمایہ بہت کم ہے اور جو ہے وہ بھی بہت وقیع نہیں۔ لیکن گذشتہ چند برسوں میں ہمارے کچھ ادیبوں اور شاعروں نے اس جانب توجہ کی ہے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابل تحسین ہے کہ اس نے دیگر موضوعات کے ساتھ ''ادب اطفال'' پر بھی خاطر خواہ توجہ مبذول کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''مشک چور شکاری'' سمرن کور کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ ہمالیہ کے بالائی حصے میں جادو اور اس کے ساتھی ہرنوں کا شکار کرتے ہیں۔ روشنی، مایا، سادھو اور ان کے دوست مشک ہرنوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ''تمام ہمالیہ کے گھنے جنگلوں اور ان میں گھومنے والے تمام جانوروں کا تحفظ کریں گے۔ وہ تشدد اور خون خرابے کو کسی طرح برداشت نہیں کریں گے اور گوشت کا کسی بھی شکل میں استعمال ان کے لیے لعنت ہوگا۔'' پوری کتاب اس اجمال کی تفصیلات کو محیط ہے۔ مصنف نے کہانی کو بہت مربوط انداز میں پیش کیا ہے اور جگہ جگہ تصویروں کے ذریعے بچوں کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے اور باتوں ہی باتوں میں ان کے ذہنی افق کو بھی وسیع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مصنف نے اس کہانی کے ذریعے بچوں میں متحرک رہنے اور خطرات کا سامنا کرنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ خون خرابے، تشدد، انسانی دہشت گردی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔

اردو ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔

اردو ناول: سمت و رفتار
مصنف: سید علی حیدر
صفحات: 223، قیمت: -/200 روپے
ناشر: شبستان، 218 شاہ گنج، الہ آباد (یو. پی.) 211003
مبصر: سید مجاور حسین رضوی، 534، عطار سوئیا، الہ آباد۔ 211003

ڈاکٹر سید علی حیدر، پانچ کتابوں کے مصنف ہیں ان میں "مرثیہ شناسی" اور "اردو ناول: سمت و رفتار" کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں کسی بھی کتاب کا ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہونا یقیناً ایک ادبی کرامت ہے۔

اس کتاب کے سات ابواب ہیں۔ ابتدائی دو ابواب میں ناول کی تعریف اور دوسری اصناف سے اس کے رشتوں پر بحث کی گئی ہے۔ ناول کے عناصر ترکیبی بیان کرتے ہوئے مصنف نے اردو ناول کی تاریخ کا نقطۂ آغاز بھی متعین کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ پریم چند سے بے حد متاثر ہیں اور ایک باب انھی کے نام وقف ہے۔ آخری دو ابواب میں انھوں نے زمانی تقسیم کی بنیاد پر آزادی سے پہلے، اور آزادی کے بعد کے اردو ناولوں کا جائزہ لیا ہے۔

ناولوں کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر رجحان ایسا نہیں ہے جس سے مصنف نے صرف نظر کیا ہو۔ ان کی رائے متوازن، واضح اور متعین ہے۔ وہ ہر سطر میں اس کا خیال رکھتے ہیں کہ طلبہ کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ وہ تنقید میں تجزیاتی انداز اپناتے ہیں۔ فارسٹر، پرسی ڈویک، اسکاٹ جیمس، والٹر ایلن، ایڈون میور، رال فاکس کے خیالات و افکار سے خوب استفادہ کیا ہے لیکن اگر انھوں نے بوتھ کی کتاب "ریٹارک آف فکشن" دیکھ لی ہوتی تو کتاب کی معنویت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ انھوں نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ تخلیق کاروں کے ارشادات سے بھی استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے جین کا کئی کے افکار سے بھی متعارف کرایا ہے اور کانڈیڈ کے افکار سے بھی کتاب مزین ہے لیکن حیرت انگیز طور پر انھوں نے کامیو کو جگہ نہیں دی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ ناول نگاری پر قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو اور انتظار حسین کے خیالات و افکار سے بھی طالب علموں کو باخبر کراتے۔

اردو کے ابتدائی ناولوں کے سلسلے میں انھوں نے سہیل بخاری کی تحقیق "فسانۂ خوش" کا ذکر نہیں کیا جو 1864 میں لکھی گئی "خط تقدیر" کا بلا سبب تذکرہ ہے۔ اسی طرح حالی کی "مجالس النسا" شاد عظیم آبادی کی "صورۃ الخیال" پر بھی کچھ سطریں ہوتیں تو بہتر تھا۔ انھوں نے آج تک کے ہر اہم ناول نگار کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کوشش میں کچھ غیر ضروری نام بھی آگئے ہیں۔ انتظار حسین کے ناول "بستی" کا ذکر ہے۔ چاند گہن، دل اور داستان، کا بھی ذکر ہوتا تو بہتر تھا اسی طرح جیلانی بانو کے "ایوان غزل" کا ذکر تو ہے مگر "بارش سنگ" ان کی نگاہ توجہ کا مرکز نہ بن سکا۔ قاضی عبدالستار کا دارا شکوہ، خالد بن ولید یا شب گزیدہ کا زیادہ تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن مصنف نے ان کا سرسری ذکر کیا ہے۔

"اردو ناول: سمت و رفتار" اپنی افادیت کے اعتبار سے طلبہ کے لیے بے حد اہم ہے ادب کے عام قاری کے لیے بھی دلچسپ اور خیال انگیز ہے۔

آشنائی کا کرب (افسانوی مجموعہ)
مصنف: ارمان شمسی
ناشر: بیسویں صدی میگزین، آئی۔ 3 مرادی روڈ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی
صفحات: 150، قیمت: -/150 روپے
مصنف کا پتہ: 148 فرینڈشپ مارکیٹ چوک سرکلر روڈ ڈھاکہ، بنگلہ دیش،
مبصر: فیروز عالم، شعبۂ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد۔

"آشنائی کا کرب" ارمان شمسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ مصنف کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے بنگلہ دیش میں اردو زبان کو تقریباً ختم کر دیا گیا ہے لیکن اب بھی وہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ موجود ہیں اس سے اطمینان بھی ہے اور یک گونہ خوشی بھی ہے کہ کیسے نامساعد حالات میں اردو کے شیدائی اس کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ارمان شمسی حرف آغاز میں لکھتے ہیں "یہاں حالات نے اردو سے محبت کرنے والوں کو ایک گہری کھائی یا اندھے کنویں میں محبوس کر رکھا ہے۔ آپ نے غریب الوطن اور غریب الدیار جیسے محاورے سنے اور پڑھے ہوں گے اب محبوس الوطن کا بھی اضافہ کر لیجیے۔ یہاں زبان سے متعلق کسی کرن کی رمق بھی نظر نہیں آتی۔ اردو کی تازہ تحریر کو دیکھے ہوئے مہینوں کیا سالوں گزر جاتے ہیں۔" (ص، 8)۔ ارمان شمسی کا اصل نام محمد ارمان ہے۔ وہ 21 اگست 1945 کو قصبہ آنولہ ضلع بریلی (یوپی) میں ایک تجارت پیشہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔

زیر نظر افسانوی مجموعے میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ "منجدھار" جاگیردار گھرانے کی وضع دار خاتون پری بانو کے ارد گرد گھومتا ہے۔ پری بانو اپنے شوہر صولت کے نامرد ہونے کے باوجود خاندان کی عزت و ناموس کے لیے پوری زندگی جنسی تشنگی میں گزار دیتی ہیں۔ شوہر کی موت کے بعد ایک طوائف کا بیٹا عدالت میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ صولت مرزا کا تنہا وارث ہے تو ان کے قدموں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ ایک طرف

حویلی ہاتھ سے جانے کا خطرہ اور دوسری طرف شوہر کی بدنامی کا خوف، پری بانو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ پھوپھی اور منیم جی کے کافی سمجھانے کے بعد وہ کسی طرح عدالت میں بیان دینے کے لیے جاتی ہیں لیکن ساعت کے دوران وہ شوہر کی بدنامی کی بجائے اپنی جان دینے کو ترجیح دیتی ہیں افسانہ ''رکھیل'' میں جنسی بے اعتدالی اور اس کے خطرناک نتائج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کیلاش ایک ہندوستانی نوجوان ہے جو ہانگ میں مادام تی سی یونگ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مادام تی سی یونگ ایک عیاش عورت ہے اور نوجوان مردوں کی رسیا ہے۔ وہ کئی مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم رکھتی ہے اور ایک نائٹ کلب بھی چلاتی ہے جہاں جسم فروشی کا کاروبار دھڑلے سے چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ جنسی بے راہ روی اپنا اثر دکھاتی ہے اور مادام کے ساتھ ساتھ کیلاش بھی ایڈس کا مریض بن جاتا ہے۔ کیلاش کے علاج کا پورا خرچ مادام اٹھاتی ہے، اس کے گھر پابندی سے ہر مہینے پیسہ بھی بھیجتی ہے لیکن یہ سلسلہ کب تک چل سکے گا ایک وقت آئے گا کہ وہ اور مادام موت کا شکار بن جائیں گے اور اس کے والدین اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکیں گے۔

''جیون ایک الاؤ'' ایک ایسی مجبور لڑکی کی کہانی ہے جو پیار میں بغیر سوچے سمجھے رامو کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ راموشرابی اور جواری ہے۔ وہ جوئے میں اپنی بیوی کو ہار جاتا ہے لیکن چمپا اپنی عزت بچانے کے لیے گھر سے کلکتہ بھاگ جاتی ہے۔ وہاں بھی اسے بدمعاشوں سے سابقہ ہے اور ایک دن وہ اپنے آپ کو کوٹھے پر پاتی ہے۔

''بھونچال'' میں ہم جنسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رضیہ اور جمیلہ کی یہ کہانی عصمت چغتائی کے ''لحاف'' کی یاد تازہ کر دیتی ہے یہ گھر اور وطن سے دور اجنبی دیسوں میں ملازمت کرنے والے افراد کی جنسی تشنگی پر لکھا گیا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار یوسف خلیجی ممالک میں نوکری کرنے والے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے نوجوانوں کی ذہنی و جذباتی کیفیات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ جولی ان لڑکیوں کی نمائندگی کرتی ہے جو دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ پیسے لے کر رنگ رلیاں منانے میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتیں۔ افسانہ ''میڈم راسپوٹن'' بھی جنسی بے راہ روی پر لکھا گیا ہے۔ ''جواب'' میں جنسی تشنگی کی شکار کسم کی داستان حیات پیش کی گئی ہے۔ ''درد کی تنہائیاں'' ''روشن دان'' ''جھوٹن'' ''چھوٹا سا گھر'' اور ''کلیجیں کا خمار'' بھی اچھے افسانے ہیں۔

ممتاز شیریں ناقد، کہانی کار
مصنف: ابوبکر عباد
صفحات: 303، قیمت: -/200
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جاوید رحمانی، اردو گھر، انجمن ترقی اردو، راؤز ایونیو، دین دیال اپادھیائے مارگ، نئی دہلی۔ 110002

ممتاز شیریں اردو فکشن کی تاریخ اور تنقید میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ جس زمانے میں انھوں نے فکشن پر مضامین لکھے وہ فکشن کی تنقید کا ابتدائی زمانہ تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تنقید اردو فکشن کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں ہنوز بامعنی اور تازہ معلوم ہوتی ہے۔ ابوبکر عباد نے پہلی مرتبہ ان کی حیات و خدمات کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب دو ضمنی ابواب سے عبارت ہے جس میں ممتاز شیریں کا مختصر تعارف ہے اور ان کے تخلیقی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب ممتاز شیریں کے افسانوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ابوبکر عباد کے مطابق ممتاز شیریں نے کل پندرہ افسانے لکھے جن میں دو نا تمام ہیں۔ گویا صرف تیرہ افسانوں سے جو شناخت ممتاز شیریں کو حاصل ہوئی معمولی بات نہیں۔ خصوصاً اس تناظر میں کہ ممتاز شیریں نے اپنی ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کی طرح سنسنی پھیلانے اور نسوانی خواہشات کا پٹارہ سر بازار کھلوانے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ اس زمانے کی بعض خاتون افسانہ نگاروں کی شہرت کا دارومدار اسی پر ہے کہ وہ میل ڈومینیٹیڈ سوسائٹی میں عورتوں کے احساسات کی ترجمانی کے نام پر فحش نگار بن گئیں اور اپنی تحریروں میں مردوں کے چٹخارے کا خوب سامان مہیا کیا۔ یہ اس زمانے میں شہرت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ تھا جس سے ممتاز شیریں نے کام نہیں لیا۔

تیسرا باب ان کی تنقید نگاری کا جائزہ ہے۔ ممتاز شیریں کی اصل شہرت بھی فکشن کے نقاد کی حیثیت سے ہے۔ ان کی تنقید کوتاہیوں سے پاک نہیں۔ وارث علوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

''ممتاز شیریں'' نے اردو کے بیش تر افسانوں کو مغربی افسانے کے حوالے سے پڑھنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی تنقید کھیل کا وہ میدان نظر آتی ہے جس میں اردو کے ہر افسانہ نگار کی ایک ٹانگ کسی نہ کسی مغربی فن کار کی ٹانگ سے بندھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس دوڑ میں بہت ہی کم جوڑے ایسے ہیں جو دو چار قدم سے زیادہ چل سکے ہوں۔''

(تنقید میں کرتب بازیاں، خندہ ہائے بےجا نومبر 1987 دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص۔ 53)

شاید یہ مضمون ابوبکر عباد کے پیش نظر نہ تھا۔ ورنہ وہ اس نہج پر بھی ممتاز شیریں

کی تنقید نگاری کا جائزہ ضرور لیتے۔ اس کے باوجود وارث علوی نے تسلیم کیا ہے کہ ''ممتاز شیریں اردو کی ایک ذہین اور طباع نقاد ہیں اور اردو افسانہ کی تنقید میں ان کا مقام استناد کا ہے'' (ایضاً)

یہ واقعہ ہے کہ اردو افسانے کی تعبیر و تفہیم میں ممتاز شیریں کے مضامین نے جو رول ادا کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ چوتھا باب دیگر ادبی خدمات کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں تراجم اور خطوط کا جائزہ لیا گیا ہے ممتاز شیریں کے خطوط کا جائزہ اور تفصیل سے لیا جاتا تو بہتر تھا تعجب ہے کہ اس باب میں صحافت کو کیوں نہ رکھا گیا۔ جمیل جالبی نے نیا دور کا مکمل اشاریہ شائع کروا دیا ہے جو کتابی شکل میں عام طور پر دستیاب ہے اور ممتاز شیریں کی ادبی شہرت کا ایک بے حد اہم پہلو نیا دور کی ادارت بھی ہے۔ چنانچہ اس باب میں ممتاز شیریں کی صحافت کو بھی شامل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ امید ہے کہ یہ کتاب فکشن اور فکشن کی تنقید سے دلچسپی رکھنے والے حلقے میں پسند کی جائے گی اور ممتاز شیریں پر مزید کاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

□□□

موصولہ کتب

شیخ چاند۔ حیات اور ادبی خدمات / ڈاکٹر سحر سعیدی

صفحات: 336 / قیمت: 200 روپے۔

ناشر / مصنف: عنایت عزیز منزل، ناگ سین کالونی، روشن گیٹ اورنگ آباد۔ 431001۔

سنہ اشاعت: 1998۔

ارمغان رباعیات کندن / کندن لال کندن

صفحات: 160 / قیمت: 100 روپے۔

ناشر / مصنف: 49 ونوبا پوری، لاجپت نگر، نئی دہلی۔ 110024

سنہ اشاعت: نومبر 2003۔

گفتگو چاند سے / ڈاکٹر فرید پربتی

صفحات: 111 / قیمت: 200 روپے۔

ناشر: فرید پربتی، ہل ویو کالونی، وانہ ہل، راولپورہ، سری نگر۔ 190005

سنۂ اشاعت: 2005۔

سہیل عظیم آبادی کا تصور عورت / (تحقیق و تنقید) / ڈاکٹر ربیعہ مشتاق

صفحات: 112 / قیمت: 90 روپے۔

ناشر / مصنف: سب ایڈیٹر ''جہان اردو'' رحم گنج، در بھنگا، بہار۔

سنہ اشاعت: 2006۔

میں اردو ہوں / عبدالقوی دسنوی

صفحات: 152 / قیمت: 150 روپے۔

ناشر / مصنف: 2 پرنس کالونی، عیدگاہ ہلز، بھوپال۔ 1

سنۂ اشاعت: 2006۔

فرید پربتی۔ شعر، شعور اور شعریات / سلیم سالک

صفحات: 272 / قیمت: 250 روپے۔

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔

سنۂ اشاعت: 2006۔

کل نا آشنا / نور پرکار

صفحات: 366 / قیمت: 250 روپے۔

ناشر: قلم پبلی کیشنز، 17/17، ایل آئی جی کالونی، پائپ لائن روڈ، کرلا (مغربی) ممبئی۔ 400070

سنۂ اشاعت: ستمبر 2006۔

آچاریہ نریندر دیو کی منتخب تحریریں / محمد محمود فیض آبادی

صفحات: 128 / قیمت: 50 روپے۔

ناشر / مصنف: شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002

سنہ اشاعت: 2006۔

امریکی نظام حکومت / محمد محمود فیض آبادی

صفحات: 113 / قیمت: 50 روپے۔

ناشر / مصنف: شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002

سنۂ اشاعت: 2006۔

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی منتخب تحریریں / محمد محمود فیض آبادی۔

صفحات: 121 / قیمت: 50 روپے۔

ناشر / مصنف: شعبۂ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002

سنۂ اشاعت: 2006۔

□□□

نورالرحمن فاروقی

منے میاں کی بکری

منے میاں شام سے اداس اداس ہیں۔ بہت خاموش، چپ چپ سے۔ منے میاں پانچ سال کے ہو چلے ہیں۔ ابا کہہ رہے تھے اب ان کو دوسرے اسکول میں جانا ہے۔ بڑا والا اسکول۔ جس کی عالیشان عمارت کو وہ اپنے چھوٹے اسکول آتے جاتے صبح شام بڑے ارمان سے دیکھا کرتے تھے۔ انھوں نے سنا تھا کہ بڑے اسکول میں دس کمرے ہیں۔ اور ایک کمرے میں تو صرف کھلونے بھرے ہوئے ہیں۔ اور بہت سارے جھولے بھی ہیں اسکول میں۔ اور ہفتہ کا دن صرف کھیلنے کے لیے ہوتا ہے۔ ابا بتا رہے تھے۔

تو؟۔ منے میاں اداس کیوں ہیں۔ خاموش، چپ چپ سے۔ ابا کا کچھ دن پہلے کام چھوٹ گیا ہے۔ اس دن سے منے میاں بہت خوش تھے۔ صبح اسکول چھوڑنے تو ابا جاتے ہی تھے۔ اب جب سے کام چھوٹا تھا، دن میں لینے بھی وہی آتے تھے۔ شام کو ساتھ میں کھیلتے بھی تھے۔ مگر آج سب گڑبڑ ہوگئی۔ شام کو ابا امی سے کہہ رہے تھے کہ اسکول کی فیس جمع کرنے کے لیے پیسے کم پڑ رہے ہیں۔ وہ بکری کو بیچ دیں گے۔ اور منے میاں اداس ہو گئے۔ بکری، ان کی اپنی بکری۔ جس کو وہ ابھی تک بچہ کہہ کر پکارتے تھے۔ جو چھوٹا سا بکری کا بچہ ابا چار مہینے پہلے ان کے لیے لائے تھے۔ اب وہ ان کے برابر کا ہو چلا تھا۔ مگر وہ اس کو پیار میں بچہ ہی کہتے تھے۔ ابا آج کہہ رہے تھے اس کے اچھے پیسے مل جائیں گے۔ فیس کے پیسے پورے ہو جائیں گے۔ منے میاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابا کا کام، نئے اسکول کی فیس اور بچہ، ان سب کا آپس میں کیا رشتہ ہے آخر۔

صبح کو ابا بچے کو لے کر چلے۔ منے میاں خاموش کھڑے تھے۔ دروازہ پکڑ کر۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روئیں۔ مگر نہیں، وہ بہادر تھے، روتے نہیں تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر بچے کو کس کر پکڑ لیں۔ نہ جانے دیں۔ مگر نہیں۔ ابا کچھ بھی غلط نہیں کرتے۔ بچے کو وہی لائے تھے۔ آج وہی لے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہی ہوگا۔ بس ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی۔ امی رو رہی تھیں پیچھے کھڑی۔ کیوں رو رہی تھیں؟ پتہ نہیں۔ ابا بھی خاموش تھے۔ بہت خاموش۔ جاتے وقت انھوں نے منے میاں کو بائے بائے بھی نہیں کیا۔ منے میاں نے بھی بچے کو بائے بائے نہیں کیا۔ بچے نے بھی کچھ نہیں کیا۔ چپ چاپ ابا کے ساتھ چلا گیا۔ بہادر بچہ۔

منے میاں نئے اسکول میں آ گئے۔ بڑے والے اسکول میں۔ جہاں دس، نہیں دس سے زیادہ کمرے ہیں۔ منے میاں کیا کریں۔ ان کو دس کے آگے گنتی ہی نہیں آتی۔ خوب سارے جھولے ہیں۔ نہ صرف جھولے ہیں، بلکہ روزانہ ایک گھنٹہ کھیلنے کے لیے ہوتا ہے۔ نئی یونیفارم، نئے جوتے، نئی کتابیں، کاپیاں، پنسل، ربڑ، بستہ۔ مگر ان کو ان سب میں اسکول جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے بچہ نہیں تھا۔ ابو امی ساتھ میں اسکول چھوڑنے آئے۔ منے میاں نے آنکھیں اٹھا کر اس اسکول کی طرف دیکھا جس نے ان سے ان کا بچہ چھین لیا تھا۔ اور خاموشی سے کلاس میں داخل ہو گئے۔ پڑھائی شروع ہوئی تو منے میاں کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کھیل کے گھنٹے میں ان سے کھیلا نہ جاتا تھا۔ کھانے کے وقت کھانا رکھا رہ جاتا تھا، یا دوسرے بچے کھا جایا کرتے تھے۔ ابا پریشان تھے، بہت پریشان تھے۔ امی بھی بہت پریشان تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں تھا۔ ابا کو دوسرا کام مل گیا تھا۔ مگر پیسے کم ملتے تھے۔ گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ ایسے ہی دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن منے میاں کی ٹیچر نے منے میاں کو ایک رقعہ دیا، کہ گھر جا کر ابا کو دے دینا۔ منے میاں نے اسے کھول کر دیکھا تک نہیں۔ بس اسے لا کر ابا کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا لکھا ہے۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے؟" امی چولھے کی آگ کم کر کے ہاتھ پونچھتی ہوئی آ گئیں۔

"ایک مہینے بعد منے میاں کے سہ ماہی امتحان ہیں۔ لکھا ہے جو بچہ سب سے زیادہ نمبر لائے گا، اس کو اگلے مہینے سے 500 روپیہ وظیفہ ملے گا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی بچہ 100 فیصد نمبر لاتا ہے تو اس کے داخلے کی فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔ کیا کریں؟ منے میاں کا تو پاس ہونا بھی مشکل ہے۔ اس سے اچھا ہوتا کہ پچھلے اسکول میں ہی پڑھنے دیتے۔" ابا پریشان ہو گئے۔

امی نے آ کر منے میاں کو گود میں اٹھا لیا، اور ابا سے بولیں، "آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں۔ منے میاں ضرور پاس ہو جائیں گے۔ میں اپنے منے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بس یہ آرزو پوری ہو جائے شاید کہ اگر فیس واپس مل جاتی تو ہم اپنی بکری کو واپس لے آتے۔ آپ نے کہہ تو دیا تھا نہ کہ ہم زیادہ پیسہ واپس دے کر بکری کو واپس لے لیں گے۔"

"ہاں،" ابا بولے، "مگر اس نے صرف دو مہینے کا وقت دیا تھا۔"

"آپ ان سے بات کر کے ایک اور مہینے کا وقت کیوں نہیں لے

لیتے؟'' امی بولیں۔

''بیکار کے خواب مت دیکھو'' ابا خفا ہو گئے، ''بس کوشش کرو کہ منے میاں پاس ہو جائیں۔''

منے میاں خاموشی سے امی کے کاندھے پر سر رکھے سب کچھ سن رہے تھے۔ ابا نے امی کو خواب دیکھنے سے منع کر دیا۔ مگر منے میاں کی آنکھوں کے سامنے سے ہزاروں خواب گزر گئے۔ سو فیصد نمبر کیا ہوتے ہیں، ان کو معلوم نہ تھا۔ مگر پچھلے اسکول میں کبھی ان کو ایک نمبر کم نہ ملا تھا۔ ایک سے دس تک کی گنتی نہ صرف وہ پڑھ سکتے تھے، لکھ سکتے تھے، بلکہ اسکول میں صرف وہ اس کو الٹے سلسلے میں لکھ سکتے تھے۔ ہندی میں اَ سے اَہ تک، اردو میں الف سے یے تک اور انگریزی میں اے سے زیڈ تک ان کو پورا پڑھنا اور لکھنا آتا تھا۔ ک، کھ، گ... آخر تک پورے اسکول میں صرف وہ پڑھ سکتے تھے۔ اور پھر انھوں نے امی کو کہتے سنا۔ 'اگر فیس واپس مل جاتی تو ہم اپنی بکری کو واپس لے آتے'۔ اور منے میاں نے آگے کچھ نہ سنا۔ امی کی گود سے اتر گئے اور جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ 'یہ سَو فیصد نمبر کیا ہوتے ہیں؟' اور منے میاں سَو فیصد نیند کے غوطے میں چلے گئے۔

خواب میں منے میاں نے ایک بہت بڑا ڈائناسار دیکھا۔ اس کا نام سَو فیصد نمبر تھا۔ جو بچہ اس کو پکڑنے کی کوشش کرتا تھا، وہ اس کو کھا جاتا تھا۔ منے میاں کی ہمت جواب دے گئی۔ انھوں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر ایک لمحے میں ڈائناسار ان کے پاس آ گیا اور اپنے بڑے بڑے پنجوں سے ان کا سر سہلانے لگا۔ منے میاں کی چیخ نکل ہی جاتی کہ ان کو اپنی امی کا چہرہ نظر آ گیا جو ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر ان کو جگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ منے میاں نے سوال کیا، ''امی، سَو فیصد کیا ڈائناسار ہوتا ہے؟'' امی ہنس پڑیں۔ اور انھوں نے سو فیصد نمبر کا مطلب بتا دیا۔

نئے اسکول میں جانے کے بعد شاید پہلی بار منے میاں نے دل سے اپنی کتاب کھولی۔ الف سے امرود۔ ان کو معلوم تھا۔ اور اَ سے انار اور اے فار ایپل بھی معلوم تھا۔ اسی لیے تو منے میاں کو پھل کھانا بالکل پسند نہ تھا۔ ان کی ہر کتاب کی شروعات پھلوں سے ہوتی تھی۔ حد تو یہ کہ گنتی کی کتاب میں بھی ایک آم، دو انار، بارہ کیلے اور بیس انگور موجود تھے۔ اگر بے سے بندر اور بی فار بال کتاب میں نہ ہوتے تو شاید منے میاں کی کتاب کبھی کھلتی ہی نہیں۔ خیر۔ آج کتابوں کے پھل منے میاں کو اتنے برے نہیں لگے۔ ویسے بھی کتابوں کے پھل کون سے کھانے ہوتے ہیں۔ اسکول کے بارہ کمرے انھوں نے اگلے دن ہی گن لیے۔ تین باتھ روم، پندرہ کمرے۔ ایک بڑا اسمبلی ہال اور ایک کھلونوں والا ہال اس کے اگلے دن گن لیے گئے۔ پھر اگلے دو دنوں میں بیس تک کی گنتی الٹی گنی جانے لگی۔ ک، کھ سے اَنگ، چا، چھ، یاں سے لے کر چھ، ترا، گیا کب ختم ہو گیا، پتہ ہی نہ چلا۔ منے میاں اپنے بلے کو بی۔اے۔ٹی = بیٹ کہنے لگے اور گلی کے کتے، بلی ڈی۔او۔جی = ڈاگ اور سی۔اے۔ٹی = کیٹ ہو گئے۔ الف۔بے = اب، بے۔سین۔ = بس، کاف۔رے۔ = کر پڑھ کر بھی منے میاں نے بس نہ کیا۔ اسکول کے ٹیچروں نے جو منے میاں کی لگن دیکھی تو ان کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے لگے۔ پریشان تھے تو ابو امی، کہ منے میاں کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔

نتیجہ آنے والے دن ابا بھی گئے منے میاں کے ساتھ۔ منے میاں کی ٹیچر کو بے حد افسوس تھا کہ وہ منے میاں کو 100 فی صد سے زیادہ نمبر نہیں دے سکتی تھیں۔ اسکول پرنسپل نے اسی وقت داخلے کی رقم کا چیک منے میاں کے ابا کو دے دیا۔ وہ ابا سے منے میاں کے مستقبل پر بات بھی کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ابا کو ذرا جلدی تھی۔ منے میاں کو اور بھی جلدی تھی۔ دونوں لوگ اسکول سے نکل کر خاں صاحب کے گھر کو چلے جن کو ابا نے بکری دی تھی۔ چلے کیا، ابا نے منے میاں کو گود میں اٹھا لیا اور تیز قدموں سے بھاگ چلے۔ خاں صاحب ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مگر یہ کہہ کر انھوں نے منے میاں کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا کہ بکری انھوں نے اسی دن صبح گلی کے قصائی کو بیچ دی تھی۔ ابا نے پلٹ کر خاں صاحب کو سلام بھی نہیں کیا۔ بس منے میاں کو اٹھایا اور قصائی کی دکان کی طرف چل دیے۔ قصائی دکان کے باہر ہی مل گیا۔ منے میاں کا بچہ بھی وہیں بندھا ہوا تھا۔ منے میاں ابا کی گود سے کود کر بچے سے لپٹ گئے اور ابا قصائی سے بات کرنے لگے۔ مگر قصائی کسی طرح راضی نہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اس نے نقد پیسے دے کر بکری لی ہے۔ اور اس کے پاس دوسرا کوئی جانور نہیں ہے اور نہ ہی پیسے ہیں کہ اور لے آتا۔ دکان میں صرف دو گھنٹے کا مال اور تھا اور ابا اس سے دو دن کی مہلت مانگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ اتنا راضی ہوا کہ، ''ٹھیک ہے۔ تمھارے بچے کی شکل دیکھ کر دو گھنٹے رک جاتا ہوں۔ دو گھنٹے میں پورے پیسے نقد لا دو اور اپنی بکری لے جاؤ۔ لیکن اگر میری دکان کا مال دو گھنٹے سے پہلے ہی ختم ہو گیا، تو آگے اللہ کی مرضی۔''

ابا سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں۔ اور منے میاں کو تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابا کا بینک پاس ہی تھا جہاں ان کا اکاؤنٹ تھا۔ مگر چیک منے میاں کے نام تھا۔ وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر بھی جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی جلدی پیسے کا انتظام کہاں سے کریں تو ابا بینک کے منیجر کے پاس پہنچے۔ اور جیسا کہ ان کو معلوم ہی تھا، منیجر نے بتایا کہ پہلے اکاؤنٹ کھلے گا۔ پھر چیک جمع ہونے کے ایک دن بعد ہی پیسے مل سکیں گے۔ یعنی کم سے کم دو دن۔ ابا مایوس، بہت دکھی، اداس چہرہ لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ منے میاں اپنے کو روک

نہیں سکے اور رونے لگے۔ اُن کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

ننھے میاں اور ابّا بینک سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ منیجر نے انھیں واپس بلوالیا۔ ''آپ اپنے بیٹے کا اپنے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ کیوں نہیں کر لیتے؟ یہ ابھی ہو جائے گا اور چیک بھی جمع ہو جائے گا۔ کل تک پیسے بھی آ جائیں گے۔''

ابا خاموش کھڑے رہے۔ ننھے میاں بھی منیجر کے سامنے خاموش ہو گئے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ آخر منیجر پھر بولا، ''کیا بات ہے؟'' اور ابا نے پوری کہانی سنا دی کہ ان کے پاس اب ایک گھنٹہ بھی مشکل سے ہے۔ منیجر نے ابا سے کہا، ''آپ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کتنے نیک اور ایماندار انسان ہیں۔ چیک بھی بڑے اسکول کا ہے۔ آپ اکاؤنٹ جوائن کرنے کی درخواست لکھیں۔ میں آپ کو اپنی گارنٹی پر روپے دلوا دیتا ہوں۔''

ابا نے جلدی جلدی سب کچھ کیا۔ منیجر نے بھی جلدی جلدی کارروائی پوری کی۔ پھر بھی روپے ہاتھ میں آتے آتے ایک گھنٹہ اور نکل ہی گیا۔ ننھے میاں کو کاندھے پر بٹھائے ابا دوڑتے ہوئے قصائی والی گلی میں داخل ہوئے۔ قصائی کی دکان خالی پڑی تھی۔ وہ خود دکان کے باہر بیٹھا پتوں سے خالی پیڑ کی ٹہنی چبا رہا تھا، جس کے پتے ننھے میاں کی بکری کا بچہ کھا رہا تھا۔ اُن لوگوں کو آتا دیکھ قصائی نے پیسوں کے بارے میں پوچھے بغیر بکری کی رسّی کھول دی۔ ننھے میاں نے بھاگ کر بکری کو گلے لگا لیا۔ ابا قصائی کے گلے لگ گئے۔

ننھے میاں بہت خوش تھے۔ ننھے میاں کے ابا بہت خوش تھے اور ننھے میاں کا بچہ بھی بہت خوش تھا۔ سب لوگ اچھلتے کودتے گھر کو چلے۔ ننھے میاں نے کہا، ''ابا، بچہ اب بڑا ہو گیا ہے۔ کیوں نہ اس کا کوئی نام رکھ دیں۔'' ابا نے کہا، ''ہاں ٹھیک ہے۔ کیا نام رکھ دیں؟''۔ ننھے میاں نے زور سے کہا، ''بکری کا بچہ۔'' ابا نے کہا، ''بکری کا بچہ۔ واہ، کتنا اچھا نام ہے۔ جلدی سے گھر چلو۔ امی کو بھی بتاتے ہیں۔'' سب لوگ ہنستے گاتے آگے چلے۔

ننھے میاں گا رہے تھے، ''بکری کا بچہ، چاؤں۔ ماؤں۔'' ننھے میاں کے ابا گا رہے تھے۔ نہ جانے کیا۔

بکری کا بچہ بھی گا رہا تھا، ''میں۔ میں۔ میں۔''

□□□

رابطہ:
43 - A, Pocket - A
Sukhdev Vihar
New Delhi - 110025

دل کی گیتا

مدوّن: مخمور سعیدی

''شریمد بھگوت گیتا'' ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے %45 اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 066 110

افتخارالزماں

نیتاجی سبھاش چندر بوس

ہماری آزادی ان گنت قربانیوں کا صلہ ہے اور اس اعتبار سے آزاد ہندوستان، مجاہدین آزادی کا مقروض ہے۔

''تم مجھے خون دو میں تمھیں آزادی دوں گا''

دلوں کو گرمانے اور رگوں میں جوش بھر دینے والا یہ نعرہ، ہندوستان کی تحریک آزادی کے بلند قامت مجاہد سبھاش چندر بوس کا ہے۔ سبھاش چندر بوس ہماری جنگ آزادی کے ان سورماؤں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنا سب کچھ مادر وطن پر نچھاور کر دیا تھا۔ تحریک آزادی میں شامل ہزاروں محب وطن آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی وطن پر قربان ہو گئے۔ سبھاش چندر بوس بھی انھی میں ہیں۔ انھوں نے نہایت نازک دور میں جذبۂ آزادی میں ایک نئی روح پھونکی۔ ان کا نام ہمیں آج بھی ان سورماؤں کے جذبۂ حب الوطنی کی یاد دلاتا ہے، جنھوں نے ملک کو انگریزی حکومت کے تسلط سے نکالنے کے لیے اپنے سروں سے کفن باندھا تھا۔ اور آزادی کی خاطر سب کچھ جھیل گئے تھے۔

سبھاش چندر بوس کی پیدائش (Cuttack) کے ایک متوسط گھرانے میں 23 جنوری 1897 کو ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی کٹک میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ کلکتہ کے پریزیڈینسی کالج میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے ہی سبھاش چندر بوس دوسرے بچوں سے مختلف تھے۔ ان میں قبل از وقت ذہنی پختگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اسکول میں انھیں نسلی امتیاز پریشان کرتا تھا اور گھر میں غیر اہم ہونے کا احساس ستاتا تھا۔ سبھاش چندر بوس اپنے والدین کی نویں اولاد تھے۔ ان کی بہن بھائیوں کی تعداد 14 تھی۔ اپنے آپ کو پانے کی جستجو انھیں سوامی وویکانند اور سری رام کرشن پرم ہنس کے خیالات سے قریب لے گئی۔ ان روحانی پیشواؤں سے انھوں نے ملک سے محبت کرنے اور خواہشات ترک کرنے کا سبق سیکھا۔

سبھاش چندر بوس 1919 میں آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کے لیے لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں وہ انگریزی، سنسکرت، فلسفہ، پولیٹکل سائنس اور جدید تاریخ کے مطالعے میں مشغول ہو گئے۔ اس مطالعے سے ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا اور ان کے علم میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ 1920 میں وہ آئی سی ایس (ICS) کے امتحان میں شریک ہوئے اور چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ لیکن وہ آئی سی ایس کا منصب ترک کر کے دل و جان سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں شامل ہو گئے اور جلد ہی صف اول کے قومی رہنماؤں میں شمار کیے جانے لگے۔

1921 میں، تحریک آزادی میں شمولیت کے وقت ان کی عمر محض 24 سال تھی۔ ملک اور قوم کی خدمت کے جذبے نے انھیں گاندھی جی کے قریب کر دیا۔ انھوں نے کلکتہ میں عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیا۔ انھوں نے عوام میں تعلیم اور سودیشی تحریک کو فروغ دینے، چھوت چھات ختم کرنے، کم عمری میں شادی کی روک تھام کرنے نیز سچائی اور انصاف کا ساتھ دینے پر زور دیا۔ انھوں نے برطانوی حکمرانوں کے خلاف لڑائی لڑنے کے لیے ہندوستانیوں کی انقلابی تنظیم کی بھرپور حمایت کی۔ ان کی قربانیوں کا نیا سفر پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی تحریک سے شروع ہو کر 17 اگست 1945 کی آخری پرواز پر اختتام پذیر ہوا۔ پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کے نتیجے میں ان کو سی آر داس (C.R.Das) اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ اس طرح وہ تحریک آزادی کے سلسلے میں پہلی بار جیل گئے۔ برطانوی حکومت نے انھیں کم و بیش 11 مرتبہ جیل بھیجا اور انھوں نے قید و بند کی سخت صعوبتیں اٹھائیں۔

سبھاش چندر بوس نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے بتدریج مختلف مرحلے طے کیے۔ وہ 27 سال کی عمر میں کلکتہ کے چیف ایگزیکیٹو کانسلر اور 33 سال کی عمر میں میئر منتخب ہوئے۔ انھوں نے بنگال اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن (Bengal Students Association) اور بنگال یوتھ ایسوسی ایشن (Bengal Youth Association) کی تنظیم کی۔ 1923 میں وہ بنگال کی صوبائی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ انھوں نے بے شمار سیاسی جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور عوام کو انگریزی حکومت کے خلاف صف بستہ ہونے کے لیے اکسایا۔ 1929 میں کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس ہندوستانی نوجوانوں کے نمائندہ لیڈروں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب آئے۔ انھوں نے اپنے غیر معمولی جوش و خروش کی وجہ سے جلد ہی عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔ برطانوی حکومت نے انھیں ایک خطرناک انقلابی کے طور پر دیکھا اور ان کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے کبھی انھیں جلاوطن کیا گیا تو کبھی نظر بند۔ لیکن انگریزی حکومت کی یہ ساری تدبیریں ان کے جوش اور ولولے کو سرد کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ 1938 میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہے۔ ان کی قیادت میں کانگریس میں

ایک نئی جان پڑگئی لیکن بعد میں حصول آزادی کے سلسلے میں کانگریس سے ان کے کچھ اختلافات پیدا ہوگئے، جن کے سبب وہ اس سے علاحدہ ہوگئے۔

سبھاش چندر بوس گاندھی جی کی عزت کرتے تھے لیکن ان کے اندھے مقلد نہ تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے Dominion Status کے مطالبے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے مکمل آزادی کے مطالبے کی وکالت کی۔ گاندھی جی کی خواہش کے برخلاف انھوں نے دوسری بار کانگریس کی صدارت کے لیے انتخاب لڑا جس میں گاندھی جی کے امیدوار کو شکست ہوئی۔ گاندھی جی نے اسے اپنی ذاتی شکست تصور کیا تو سبھاش چندر بوس کو سخت تکلیف ہوئی۔ اختلافات نے شدت اختیار کی تو سبھاش چندر بوس نے عہدۂ صدارت کو خیرباد کہہ دیا اور فارورڈ بلاک کے نام سے ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کرلی۔ یہاں سے سبھاش چندر بوس کی زندگی میں نئے دور کی شروعات ہوئی۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جنگ سے پیدا شدہ حالات کا فائدہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے اٹھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے برطانیہ مخالف سرگرمیاں تیز تر کیں تو نظر بند کر دیے گئے۔ مگر وہ اپنا راستہ طے کر چکے تھے۔ وہ برطانیہ دشمن قوتوں کا سہارا لے کر مسلح جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اچانک 17 جنوری 1941 کی صبح کو دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب ہوگئے۔ ملک کے لیے یہ ہنگامہ خیز خبر تھی۔ ان کی ڈرامائی مگر منصوبہ بند روپوشی آزادی کی جدوجہد میں ایک نیا موڑ تھا۔ اذیت ناک، صبر آزما مرحلوں سے گزرتے ہوئے وہ برلن پہنچ گئے جہاں انھوں نے آزاد بھارت کا مرکز قائم کیا اور سرزمین جرمنی پر آزاد ہند فوج کی تشکیل کی۔

1943 میں وہ جرمنی سے ایک آب دوز کشتی میں سوار ہوکر 90دن کے طویل سفر کے بعد جاپان پہنچے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے جاپان سرکار سے امداد کی یقین دہانی حاصل کی۔ ان دنوں مشرقی ایشیا میں وطن پرستی کی عجیب لہر دوڑ رہی تھی۔ جاپان میں راس بہاری بوس، تھائی لینڈ میں بابا امر سنگھ اور شنگھائی میں بابا عثمان اور ستیا نند پوری جیسے قوم پرست آزادی کے لیے برسرپیکار تھے۔ نیتاجی کی آمد نے ان تمام تحریکوں کو نیا رخ اور نئی زندگی دی انھوں نے گویا ایک نیا محاذ کھول دیا جو بہ یک وقت سیاسی، فوجی اور تہذیبی محاذ اور جو مغرب میں برما سے لے کر مشرق میں جاپان تک اپنی موجودگی کا احساس کرنے لگا۔ آزاد ہند فوج (INA) کا رہنما اصول تھا 'اتحاد، یقین، اور قربانی۔'' 21 اکتوبر 1943 کو نیتاجی نے سنگاپور میں انڈین انڈی پینڈینس لیگ (Indian Independence League) کے نمائندوں کی ایک میٹنگ میں آزاد ہند فوج صوبائی حکومت قائم کرنے کا اہم اعلان کیا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس سپریم کمانڈر تھے۔

سبھاش چندر بوس رنگون پہنچے تو مسز ہیم راج نے اپنا تمام اثاثہ ان کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ فوجی طاقت کے بل پر ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ اور انڈمان نکوبار جزائر حاصل کر لیے۔ کامیابی کی اس گھڑی میں انھوں نے رنگون ریڈیو سے گاندھی جی سے درخواست کرتے ہوئے کہا: ''اے ہندوستان کے باپو— ہندوستان کی اس مقدس جنگ میں ہم آپ کی دعاؤں اور نیک خواہشات کے خواہاں ہیں۔'' شدید اختلافات کے باوجود اس قسم کے جذبات ایک عظیم انسان کے ہی ہو سکتے ہیں۔

آزاد ہند فوج کا قیام نیتاجی سبھاش چندر بوس کا عظیم کارنامہ تھا یہ فوج اتحاد اور عدم تفریق کا مثالی نمونہ تھی۔ ان کی مشترک زبان ہندوستانی تھی۔ اس کا سلام 'جے ہند' اور اس کا جھنڈا ''ترنگا'' تھا۔ کیپٹن لکشمی کے تحت جھانسی کی رانی رجمنٹ صرف خواتین پر مبنی اپنی قسم کی پہلی ہندوستانی فوج تھی۔ یہی نہیں ان کے آزاد ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام بھی سات زبانوں میں نشر ہوتے تھے۔

آزاد ہند فوج کی ناکامی اور اس کے سترہ ہزار مجاہدوں کی گرفتاری بھی قومی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا وسیلہ بنی۔ لال قلعہ میں چلائے جانے والے مقدمہ کے دوران لوگوں میں عجیب جوش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ملک میں عزت نفس کی بحالی کا شعلہ پوری طرح بھڑک چکا ہے۔ آزاد ہند فوج نے ملک سے برطانوی حکومت کے خاتمے کے سلسلے میں ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کی حب الوطنی، شجاعت اور قربانی کی داستان آج بھی ہندوستانیوں کے دلوں کو گرماتی ہے۔

بلاشبہ نیتاجی عظیم تھے مگر قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ انھوں نے 17 اگست 1945 کو ایک فوجی جہاز میں آخری پرواز کی، ایک ایسی پرواز جو فضا میں ہی کھوگئی۔ اور سبھاش چندر بوس ماضی کے ان شہیدوں اور انقلابیوں کی لمبی قطار میں شامل ہوگئے۔ ان کی ناگہانی موت کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ آج تک ان کی موت کا معمہ حل نہیں ہوسکا ہے کیوں کہ نہ تو اس جہاز کا ملبہ مل سکا اور نہ ہی ان کی لاش مل سکی۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس لال قلعہ تک نہ پہنچ سکے مگر 15 اگست 1947 کو ان کا لال قلعہ پہنچنے کا مقصد ان کی ملت نے پورا کر دیا۔

□□□

رابطہ:
K-78/A, 1st Floor
Batla House, Okhla
New Delhi - 110025

قومی اردو کونسل کی جانب سے ہماچل آرٹ، کلچر اینڈ لینگویج اکیڈمی، شملہ کے زیر اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی سینٹر کے فارغین کے لیے گذشتہ 12 اکتوبر 2006 کو جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر ایک طالب علم کو سند دیتے ہوئے ہماچل پردیش کے وزیر خوراک جناب سکھی رام، ساتھ میں (بائیں) ہماچل آرٹ، کلچر اینڈ لینگویج اکیڈمی کے ڈائرکٹر جناب پریم شرما اور (دائیں) سکریٹری محترمہ شکما کپلا۔

قومی اردو کونسل کی جانب سے میسور ایجوکیشنل سوشل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کے زیر اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی کورس کے فارغین کے لیے گذشتہ 25 نومبر 2006 کو ایک جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication 24/12/2006

URDU DUNIYA Monthly, January 2007, Vol. 9, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H R.D , Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

"فکر و تحقیق" کا تازہ شمارہ "داغ دہلوی نمبر" ہے جوان کی وفات پر سو سال گزر جانے پر شائع کیا گیا ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں جہاں ایسے مضامین شامل ہیں جو داغ کی شخصیت اور شاعری پر نئی روشنی ڈالتے ہیں، وہیں کچھ مضامین ان کے اہم شاگردوں کا تعارف کراتے ہیں جنھیں اپنے استاد کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔

"فکر و تحقیق" کا داغ دہلوی نمبر اردو کے اس باکمال شاعر کو خراج عقیدت بھی ہے اور داغ کے فکر و فن کی تفہیم و تحسین کی ایک سنجیدہ کوشش بھی۔

272 صفحات پر مشتمل اس یادگار نمبر کی قیمت عام شماروں جتنی ہی رکھی گئی ہے۔

"فکر و تحقیق" کی سالانہ قیمت صرف سو روپے ہے، فی شمارہ پچیس روپے۔

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے حضرات چیک نہ بھیجیں

غیر ملکی خریداروں کے لیے

	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	سادہ ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری
پاکستان	184 روپے	172 روپے	316 روپے	256 روپے
نیپال	228 روپے	160 روپے	360 روپے	292 روپے
بنگلہ دیش	174 روپے	146 روپے	306 روپے	238 روپے
دیگر ممالک	220 روپے	160 روپے	396 روپے	336 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک:8، ونگ:7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

Printed and Published by Rashmi Chowdhary, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K Puram, New Delhi-110066, Editor Rashmi Chowdhary, Tel 26103381, 26103938